حِکمت

ڈاکٹر صفدر محمود

Marfat.com

حِکمت

ڈاکٹر صفدر محمود

جُمہوری پبلیکیشنز

Marfat.com

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔ حکمت
• مصنف۔ ڈاکٹر صفدر محمود
• اشاعت۔ 2015ء
• سرورق۔ مصباح سرفراز
• ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور
• جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-652-025-2

قیمت 390 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

۱۲۷۹۰۷

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی کسی شکل میں دوبارہ اشاعت کی اجازت نہیں ہے۔ باقاعدہ قانونی معاہدے کے تحت جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

Hikmet

Copyright © 2015, Jumhoori Publications

ALL RIGHTS RESERVED. This book contains material protected under International and Federal Copyright Laws and Treaties. Any unauthorized reprint or use of this material is prohibited. No part of this book may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopying, recording, or by any information storage and retrieval system without express written permission from the publisher.

Find us on facebook

Jumhoori Publications
2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan
T: +92-42-36314140 F: +92-42-36283098
info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

Marfat.com

فہرست

1	عرضِ مصنف	05
2	حکمت پر یقین	07
3	آزمائش	11
4	مرشد اور مرشدِ کامل (I)	14
5	مرشد اور مرشدِ کامل (II)	18
6	مرشد اور مرشدِ کامل (III)	22
7	مرشد اور مرشدِ کامل (IV)	26
8	ہجرت نبویؐ کے چند معجزے	30
9	مٹی	34
10	اِس رنگ برنگی دُنیا میں........	38
11	عزت اور شہرت؟	42
12	غزوۂ بدر	46
13	عید میلاد النبی کیوں کر اور کیسے؟	48
14	تاریخ کی کرامات	51
15	تاریخی جھرو کے دل کے داغ جل اُٹھے	54
16	خوف زدہ	58
17	قدرت کے انعامات اور ہماری نااہلی	61
18	مبارک باد...... کس کو؟	65
19	پاکستان کیوں ٹوٹا؟......ایک بنیادی حقیقت یاد رکھیں	68
20	دسمبر 1971ء کے زخموں سے خون رستا رہے گا	72

Marfat.com

21 دیکھتا چلا گیا 76
22 اقبال، ایک آفاقی شاعر اور مفکر 80
23 مقاماتِ اَدب کے تقاضے 84
24 بولوں تو تری رُسوائی ہے 87
25 اقبال سے قائدِ اعظمؒ تک 91
26 قائدِ اعظمؒ کی مسجد 95
27 مذمت سے مرمت تک 98
28 گستاخ اَکھیاں 101
29 قائدِ اعظم اور قائدِ اعظم ثانی 105
30 بدقسمت عہد...... حضرت اویس قرنیؓ کے مزار پر حملہ 109
31 مرشد 113
32 خزاں میں بہار 116
33 منافرت پھیلانے والوں سے ہوشیار رہو 119
34 خود احتسابی کی دولت 123
35 موجودہ سیاسی کلچرل کی جہتیں(I) 126
36 ہمارے سیاسی کلچرل کی جہتیں(II) 129
37 ہمارے سیاسی کلچرل کی جہتیں(III) 132
38 پاکستان کے سیاسی کلچر کی جہتیں(IV) 136
39 حال میں زندہ 140
40 معاملہ ہے بابائے قوم کا، دوستو احتیاط سے کام لو 144
41 ایک یاد......ایک بات 148
42 جعل سازI 152
43 جعل سازII 156

Marfat.com

عرضِ مصنف

میں نے روحانی محسوسات اور قلبی وارداتوں سے نکلنے والی تحریروں کا نام ''حکمت'' رکھ دیا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ میں ''خود حکمت'' کی گہرائی اور مفہوم سے آگاہ نہیں۔ میں نے زندگی کے سفر میں بے شمار ایسے لوگ دیکھے ہیں، جو ذہین تھے، لیکن بصیرت سے محروم تھے۔ بے شمار ایسے لوگ دیکھے ہیں، جو بصیرت رکھتے تھے، لیکن حکمت سے محروم تھے، تب راز کھلا کہ ذہانت، بصیرت اور حکمت زندگی کے الگ الگ شعبے ہیں، لیکن حکمت ایسا شعبہ یا قدرت کا ایسا انعام ہے، جس کی بنیاد ذہانت اور بصیرت دونوں پر رکھی جاتی ہے۔ میں اس بات پہ پختہ یقین رکھتا ہوں کہ ہر شے من جانب اللہ ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ ''العلیم''، ''البصیر'' اور ''الحکیم'' ہیں، یعنی یہ اللہ پاک کے اسمائے حسنیٰ ہیں۔ حکمت کا لفظی ترجمہ تو ''دانائی'' اور ہر چیز کی حقیقت دریافت کرنے کا علم ہے، لیکن دراصل علم، بصیرت اور حکمت اللہ پاک کی ملکیت اور قدرت کے خزانے ہیں، جن سے وہ جس قدر چاہے، جو چاہ اور جسے چاہے عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو ذہانت عطا ہوتی ہے، بعض کو بصیرت اور کم کم کو حکمت کا نور ملتا ہے، کیوں کہ یہ عطا رضائے الٰہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے نہ کہ اپنی محنت اور کسب کی۔ میں نے ناخواندہ حضرات میں بھی بصیرت اور بعض میں حکمت بدرجہ اتم پائی، اگر چہ بہ ظاہر دنیاوی علم سے محروم تھے۔ اولیائے کرام اللہ پاک کے ''ولی'' اور پسندیدہ بندے ہوتے ہیں، چناں چہ انھیں قدرت اپنے خزانوں سے خوب نوازتی ہے۔ وہ چاہے دنیاوی حساب سے نیم خواندہ ہوں، لیکن ان میں ذہانت، بصیرت اور حکمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور وہ انھی خوبیوں سے دلوں کی کائنات کو مسخر کرتے ہیں۔

اس کتاب میں ایسی تحریریں شامل ہیں، جن کی اکثریت نے قلب و نگاہ اور روحانی

Marfat.com

محسوسات و کیفیات سے جنم لیا، گویا یہ تحریریں قلبی مشاہدات کی وارث اور شاہد ہیں۔ مشاہدات نگاہوں کے بھی ہوتے ہیں اور قلب کے بھی...... نمایاں فرق یہ ہے کہ نگاہوں کے مشاہدات فلمی مناظر کی طرح ہوتے ہیں، جنھیں ہم دیکھتے اور منظر بدلنے کے ساتھ بھول جاتے ہیں۔ انھیں سطحی مشاہدات کہنا چاہیے، جب کہ قلبی مشاہدات قلب پر واردات کے مانند نازل ہوتے ہیں اور پھر قلب میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ انسان کا مستقل اثاثہ بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اثاثہ روحانی عمل کا حصہ ہوتا ہے، اس لیے ہر ایک کو ایک جیسا عطا نہیں ہوتا...... کسی کو زیادہ، کسی کو کم۔ اپنے اپنے ظرف اور اپنے اپنے مقدر کے مطابق۔

میں خود روحانی دنیا کا مسافر ہوں نہ مجھے روحانیت کا علم ہے، کبھی کبھی لگتا ہے، شاید میں اس دنیا کا ایک بھٹکا ہوا راہی ہوں، جسے اولیاے کرام کی مجالس نصیب ہوئیں، لیکن وہ چشموں کے قریب رہ کر بھی پیاسا اور تشنہ رہا۔ مطلب یہ کہ بات ہے اپنے اپنے نصیب کی، لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت کہ انسان اولیاے کرام کی مجالس سے تہی دامن نہیں لوٹتا۔ باطن کی روشنی نصیب نہ بھی ہو تو ان کی نگاہ قلب پر پڑتی رہتی ہے اور اپنے نقش و نگار بناتی رہتی ہے۔ اس سلسلے کا نام قلبی واردات اور قلبی مشاہدات ہوتا ہے اور ایسے ہی قلبی مشاہدات اور روحانی محسوسات کے بطن سے جنم لینے والی تحریریں حکمت کی صورت میں پیش خدمت ہیں۔

ڈاکٹر صفدر محمود، لاہور

5 جون 2015ء

Marfat.com

حکمت پر یقین

موجودہ صدی کے عظیم برطانوی مؤرخ ٹائن بی کی اپنی زندگی کے حوالے سے لکھے گئے مضامین پڑھتے ہوئے ، مجھے خیال آیا کہ کم از کم دو واقعات ایسے ہیں، جنھیں قارئین سے شیئر کرنا چاہیے۔ ہر انسان کی زندگی تجربات ومشاہدات کی کہانی ہوتی ہے اور ہر تجربے میں کوئی نہ کوئی سبق مضمر ہے۔ بہت سے تجربات میں یکسانیت پائی جاتی ہے، لیکن بہت سے تجربات انفرادی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قسم قسم اور رنگ رنگ مخلوق پیدا کی ہے اور یہی اس کائنات کا حسن ہے۔ انفرادیت کے باوجود بعض اوقات کسی کی کہانی سن کر یوں لگتا ہے، جیسے یہ میری ہی کہانی اور میری ہی قلبی واردات سنا رہا ہو۔ ابھی چند روز قبل اسلام آباد سے ایک صاحب پہلی مرتبہ مجھے ملنے آئے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد، جب انھوں نے اپنی گفتگو کی گٹھڑی کھولی، تو مجھے یوں لگا، جیسے وہ مجھے میری ہی قلبی واردات سنا رہے ہیں۔ بہ ہر حال یہ زندگی کے انوکھے راز ہیں، کچھ راز سمجھ میں آجاتے ہیں اور کچھ راز سمجھ کی رسائی سے بالاتر رہتے ہیں، پھر سمجھنے اور راز تک رسائی کی بھی اپنی اپنی صلاحیت اور اہلیت ہوتی ہے، جو سب کی یکساں نہیں ہوتی۔ ٹائن بی کا لکھا ہوا واقعہ گزشتہ کالم میں بیان کر چکا ہوں۔ آج دوسرے واقعے کی باری ہے۔ ٹائن بی نے لکھا ہے کہ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ سکندر اعظم سقراط اور افلاطون ارسطو کا ملک دیکھے، چناں چہ وہ یونان کے شہر ایتھنز پہنچ گیا۔ ایتھنز کی سیر کرتے کرتے طبیعت سیر ہوگئی، تو وہ شہر سے دُور نکل گیا۔ ایک روز پہاڑیوں اور کھنڈرات کی طویل سیر کے دوران اسے شدت سے پیاس محسوس ہوئی، وہ پانی ڈھونڈنے لگا۔ چلتے چلتے اسے ایک چشمہ نظر آیا۔ پیاس سے برا حال تھا، وہ چشمے پر بیٹھ کر اور ہاتھوں کو پیالہ بنا کر پانی پینے لگا۔ جب وہ جی بھر کر پانی پی چکا اور

Marfat.com

اُٹھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک یونانی دیہاتی اس کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ٹائن بی کو یونانی نہیں آتی تھی اور اس دیہاتی کو انگریزی۔ وہ اسے کیا پیغام دینا چاہتا تھا، ٹائن بی کچھ نہ سمجھ سکا۔آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے اور پھر ٹائن بی اپنے ہوٹل لوٹ آیا۔رات کو بیماری نے حملہ کیا اور ٹائن بی قیام مختصر کر کے لندن واپس چلا گیا۔ایک ہی دن میں پیٹ کے درد اور شدید پیچش نے اسے نڈھال کر دیا۔ ہسپتال داخل ہوا، تو راز کھلا کہ اس نے جس چشمے سے پانی پیا تھا، وہ چشمہ زہریلا تھا اور اس پانی نے اسے آنتوں کے ایسے روگ میں مبتلا کر دیا تھا، جو دائمی نوعیت کا ہے۔کئی ہفتے ہسپتال میں گزارنے کے بعد، جب وہ گھر لوٹا تو اس خیال سے پریشان رہنے لگا کہ اب وہ نارمل زندگی نہیں گزار سکتا اور نہ ہی دوسرے دوستوں کے مانند ہر قسم کا کھانا کھا سکتا ہے۔جسمانی کمزوری کے ساتھ ساتھ مستقبل کے اندیشہ ہائے دور دراز نے اُس کی زندگی کے خواب بکھیر دیے۔ وہ زندگی میں کوئی بڑا علمی کارنامہ سرانجام دینا چاہتا تھا، لیکن صحت کی کمزوری راستے کی رکاوٹ بن گئی۔ وقت کا دھارا بہتا رہا، وہ خاصی حد تک روبہ صحت ہو گیا اور محتاط زندگی کا انداز اپنا کر لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔اسے اکثر یہ خیال پریشان کرتا کہ اس نے یونان جا کر بیماری خرید لی، پھر وہ اداس ہو کر اپنے خالق، اپنے خدا سے شکایت کرنے لگا کہ اے میرے خدا تم نے میرے ساتھ کیا کیا؟ میرے پرانے دوست اور کلاس فیلوز صحت مند زندگی گزار رہے ہیں۔ ہنستے کھیلتے اور کھاتے پیتے ہیں، جب کہ میں آغاز جوانی ہی میں دائمی مرض میں مبتلا ہو کر مریض بن گیا ہوں۔میرے خدا! تم نے مجھے کس جرم کی سزا دی، اگر یہ جرم کی سزا ہے، تو پھر دوسرے مجرموں کو ایسی سزائیں کیوں نہیں ملتیں؟ اے خدا! تم نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔

وقت تیزی سے کروٹیں بدلتا رہا اور عالمی اُفق پر جنگ کے بادل لہرانے لگے، پھر جنگ عظیم اول چھڑ گئی۔جنگ کے شعلے اس قدر پھیلے کہ انھوں نے سارے برطانیہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک وقت آیا کہ فوج میں کمی کو پوری کرنے کے لیے جبری بھرتی کا قانون نافذ کر دیا گیا اور اس قانون کے تحت مخصوص عمر کے نوجوانوں پر فوجی سروس لازمی قرار دے دی گئی۔اس قانون سے فرار کی کڑی سزا رکھی گئی تھی، چناں چہ نوجوانوں کے پاس فوجی بھرتی کے مراکز میں جانے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ بچا تھا۔میرے کلاس فیلوز، گلی اور محلے میں میرے ساتھ بچپن سے لے کر جوانی تک پروان چڑھنے والے اور میرے ساتھ کھیلنے والے سارے نوجوانوں کو حکم ملا کہ وہ فوجی بھرتی کے مراکز میں رپورٹ

Marfat.com

کریں۔ہم ہرگز فوج میں جانا نہیں چاہتے تھے،لیکن قانون کے جبر نے ہمارے مستقبل کے خواب مٹی میں ملا دیے اور ہمیں اپنے مستقبل کے منصوبوں کو دفن کر کے ان مراکز میں رپورٹ کرنا پڑا۔ٹائن بی لکھتا ہے کہ میرے تقریباً تمام دوست اور شناسا جسمانی فٹنس کی وجہ سے فوج میں بھرتی کر لیے گئے، لیکن مجھے اس بنیاد پر مسترد کر دیا گیا کہ میں آنتوں کی بیماری کا مریض تھا۔میرے ان دوستوں کو فوجی تربیت کے مراحل سے گزار کر مختلف جنگی محاذوں پر بھجوا دیا گیا،جہاں سے مجھے وہ دکھ بھرے خطوط لکھتے اور فوجی زندگی کی سختی، ہمہ وقت موت کا خوف اور فوجی سزاؤں کی کہانیاں بیان کرتے۔جنگ طویل اور خطرناک ہو کر جنگ عظیم بن گئی اور اس نے نہ صرف بے شمار نوجوانوں کی زندگیوں کے چراغ بجھا دیے، بل کہ اَن گنت خاندانوں کو بھی برباد کر دیا۔ٹائن بی لکھتا ہے، پھر ایک ایک کر کے میرے دوستوں کی موت کی خبریں آنے لگیں اور جنگ کے خاتمے تک ان کی اکثریت موت کی وادی میں گم ہو چکی تھی، جو زندہ بچے، ان میں کچھ اپاہج ہوئے، کچھ نفسیاتی مریض بنے اور ایک دو معمول کی زندگی میں لوٹ آئے،لیکن ان کو نارمل ہونے میں خاصا وقت لگا۔ٹائن بی کے بقول اسے اپنے دوستوں اور شناسا چہروں کی ناگہانی وفات اور انجام دیکھ کر احساس ہوا کہ جسے وہ دائمی مرض سمجھتا تھا وہ دراصل خدا کی رحمت تھی، جس نے اسے فوجی زندگی کی سختی اور جنگی محاذ پر ناگہانی وفات سے بچالیا تھا۔تب اُس نے محسوس کیا کہ یہ خداوند کی غیبی مدد تھی، جسے وہ روگ سمجھتا رہا۔اَللہ تعالیٰ نے اسے چھوٹی مصیبت میں مبتلا کر کے بڑی مصیبت سے بچالیا تھا۔وہ طویل عرصے تک خدا سے ناراض رہ کر شکایات کے ڈھیر لگانے پر شرمندہ ہوا اور ہر لمحہ اپنے خالق کا شکر ادا کرنے لگا۔وہ محسوس کرنے لگا کہ اکثر محرومیوں، ناکامیوں اور مصیبتوں میں انسان کے لیے کوئی نہ کوئی بہتری یا بھلائی مضمر ہوتی ہے،جس کا راز وقت گزرنے کے بعد کھلتا ہے،لیکن انسان گھبرا کر چیخنے چلانے لگتا ہے، پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا خالق اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے،جس کے لیے اسے زندگی کی مہلت دی گئی ہے۔ٹائن بی کی زندگی کا یہ واقعہ پڑھتے ہوئے مجھے حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کا یہ صوفیانہ فقرہ یاد آرہا تھا کہ خدائی فیصلے الل ٹپ نہیں ہوتے، ان میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنی زندگی کے سفر پر نظر دوڑائی، تو مجھے بے شمار ایسے واقعات یاد آئے، جن سے مجھے اس وقت صدمہ ہوا تھا، دل ٹوٹا تھا، احساس محرومی ہوا تھا،لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد پتا چلا کہ دراصل اس صدمے، ناکامی اور محرومی میں میرے لیے بہتری اور ''حکمت'' پوشیدہ تھی، جسے میں سمجھنے سے قاصر رہا۔کئی بار

Marfat.com

ایسا ہوا کہ میرے رب نے مجھے کسی چھوٹی مصیبت میں مبتلا کر کے کسی بہت بڑی مصیبت سے بچالیا، کئی آزمائشوں کا مقصد بھٹکنے سے بچانا اور سیدھی راہ پر لانا تھا اور ہاں! بے شمار واقعات اور معاملات ایسے بھی ہیں، جن کی حکمت آج تک سمجھ میں نہیں آئی اور شاید کبھی بھی سمجھ میں نہیں آئے گی، کیوں کہ قدرت نہ سارے راز بے نقاب کرتی ہے اور نہ ساری حکمتیں انسان پر ظاہر کرتی ہے۔ آپ بھی اپنی زندگی پر نظر ڈالیں، آپ کو بھی اپنی زندگی میں ایسے کئی واقعات نظر آئیں گے، جن میں کوئی نہ کوئی خدائی حکمت پوشیدہ تھی۔ مطلب یہ کہ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں اور اس سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھیں اور یقین رکھیں۔

Marfat.com

آزمایش

برطانوی مؤرخ ٹائن بی کو گزشتہ صدی کا سب سے بڑا مورخ سمجھا جاتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ اس کا تحقیقی کام حیرت انگیز ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں ٹائن بی کے ذاتی زندگی کے حوالے سے لکھے ہوئے مضامین پڑھ رہا تھا، تو مجھے اس کے دو تجربات یا مشاہدات خاصے دلچسپ لگے، چناں چہ خیال آیا کہ انھیں اپنے قارئین سے شیئر کرنا چاہیے۔ اسے میری کمزوری جانیں کہ اکثر فکر انگیز یا معلوماتی یا دلچسپ تحریریں پڑھتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ انھیں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کروں۔ سیاسی کالم، جسے آپ تجزیے کہتے ہیں، خیال آرائی، بزم آرائی اور اپنی پسند و ناپسند کا اظہار ہوتا ہے، کچھ اندازے اور کچھ معلومات ہوتی ہیں، جو دن ڈھلنے تک باسی ہو جاتی ہیں، لیکن زندگی کی بنیادی سچائیاں، حقیقتیں اور تجربات، ایسا چشمہ ہے، جو زندگی کے خاتمے تک بہتا رہے گا اور غور و فکر کا سامان مہیا کرتا رہے گا۔

ٹائن بی نے انگلستان کے ایک اعلیٰ اور معیاری پبلک سکول میں تعلیم حاصل کی، جس میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ ڈسپلن، یعنی نظم و ضبط اور کردار سازی پر زور دیا جاتا تھا۔ ٹائن لکھتا ہے کہ سکول کے ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں ہمیشہ ایک ڈنڈا دیوار کے ساتھ لٹکتا رہتا تھا، جسے ہیڈ ماسٹر نے کبھی ہاتھ لگایا اور نہ ہی طلبا کو مارنے کے لیے استعمال کیا، اگر آپ اچھے وقتوں میں سرکاری سکولوں میں زیر تعلیم رہے ہوں، تو میری طرح آپ کو بھی یاد ہوگا کہ ہمارے سکولوں میں اساتذہ فراخ دلی سے ڈنڈے کا استعمال کرتے تھے۔ اس ڈنڈے کو بگڑے تگڑوں کا علاج تصور کیا جا سکتا تھا اور عام طور پر مولا بخش کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ استاد کے ڈنڈے کو مولا بخش کیوں کہتے تھے، شاید اس لیے کہ یہ ڈنڈا غلطیاں بخشواتا تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈنڈا بگڑے تگڑوں کا کسی حد تک مؤثر علاج تھا اور طلبا اس کے خوف سے محنت بھی کرتے تھے، ہوم

Marfat.com

ورک بھی بہ ہر صورت کر کے لاتے تھے اور سکول میں کوئی نازیبا حرکت کرنے سے بھی اجتناب کرتے تھے۔
ہمارے دور میں اُستاد کا ادب اور ڈنڈے کا خوف مل کر ایسے رعب و داب کا سماں پیدا کرتے تھے کہ سکولوں کے رزلٹ بھی اچھے آتے تھے اور سکولوں کا ماحول بھی مہذب اور پرامن رہتا تھا۔

ٹائن بی کا کہنا ہے کہ کچھ اُستاد کبھی کبھار معمولی جسمانی سزا بھی دے لیتے تھے، لیکن ہیڈ ماسٹر نے دفتر میں ڈنڈا لٹکانے کے باوجود کبھی اس کا استعمال نہیں کیا۔ دراصل یہ ایک علامت تھی اور اس علامت کا خوف اصل سے کہیں زیادہ تھا، اگر ہیڈ ماسٹر اس علامت کا استعمال کر لیتا، تو شاید اس کا خوف بھی کم ہو جاتا۔ ٹائن بی کا کہنا ہے کہ ہیڈ ماسٹر کے پاس ڈنڈے کا اختیار تھا اور یہ اختیار ہی دراصل اس کا امتحان اور آزمائش تھی کہ وہ اس کا استعمال کیسے کرتا ہے، محض علامت کے طور پر یا اسے استعمال کرے!
مطلب یہ کہ اقتدار یا اختیار ایک طرح سے آزمائش ہوتی ہے کہ حکمران یا صاحب اختیار اس کا کس طرح استعمال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اختیار چھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بڑا بھی، محدود بھی ہو سکتا ہے اور لامحدود بھی۔
ہم میں اکثریت کسی نہ کسی شعبے میں، کسی نہ کسی حد تک صاحب اختیار ہے۔ کسی کا سارے ملک پر اختیار اور اقتدار کا سکہ چلتا ہے، تو کسی کا چھوٹے سے محکمے، دفتر یا ادارے پر اور کسی کا اختیار صرف گھر تک محدود ہوتا ہے۔ اقتدار یا اختیار چھوٹا ہو یا بڑا یہ ایک آزمائش یا امتحان ہوتا ہے، جس سے اس کی اہلیت، صلاحیت، اخلاق، کردار اور شخصیت کے راز کھلتے ہیں۔ دیکھا جائے، تو دولت بھی آزمائش ہے، حسن بھی آزمائش ہے، علم بھی آزمائش ہے، حتیٰ کہ صحت اور بیماری بھی آزمائشیں ہیں۔ آزمائش سے مراد فقط یہ ہے کہ اللہ پاک کا دیا گیا اقتدار، اختیار، دولت، حسن، علم اور صحت کو آپ کیسے اور کس طرح استعمال کرتے ہیں؟
مصیبت، مشکل اور بیماری کی آزمائش صبر ہے کہ آپ کتنا صبر کرتے ہیں، اگر اختیار کو لوگوں کی بھلائی کے لیے استعمال کیا جائے نہ کہ مخلوق خدا کو آزار دینے، ناانصافی کرنے، تذلیل کرنے یا خون بہانے کے لیے تو صاحبان اختیار سرخرو ٹھہرے اور دونوں جہانوں میں کامیاب ہوئے، ورنہ سزا کے مستوجب قرار دیے گئے، اگر دولت ضرورت مندوں، محتاجوں، انسانی خدمت اور رضائے الٰہی کی راہ میں خرچ ہوئی تو کامیابی مقدر بنی، اگر یہی دولت غرور، تکبر، عیش وعشرت اور دنیا کمانے پر صرف ہوئی، تو سانپ بن کر ڈسے گی اور چیخ و پکار پر کوئی مدد کو بھی نہیں آئے گا۔ حسن اللہ کی دین ہے، اپنی کمائی ہرگز نہیں، لیکن اس کے ساتھ آزمائش بھی وابستہ ہے، اگر حسن کی قیمت وصول کی گئی، اسے گمراہی کے لیے استعمال کیا یا یہ غرور اور دوسروں کے لیے حقارت کا باعث بنا، تو سمجھ لیجیے کہ یہ بدصورتی شمار ہوگا اور عبرت کا سامان بنے گا۔ علم و

Marfat.com

شہرت مقدر کا حصہ ہوتے ہیں، لیکن ان میں اپنی محنت اور کمائی بھی شامل ہوتی ہے۔ دراصل جب یہ محنت رنگ لاتی ہے، تو کمائی کہلاتی ہے اور اصل میں یہ کمائی اللہ پاک کی دی گئی توفیق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اللہ پاک توفیق نہ دیں تو محنت نہیں ہو سکتی اور محنت ہو بھی تو غارت جاتی ہے اور گھاٹے کا سودا کہلاتی ہے۔ جب محنت رنگ لاتی ہے، تو انسان اسے اپنی قابلیت اور قربانی کا ثمر سمجھتا ہے، لیکن جب محنت ناکامیوں کی وادیوں میں کھو جائے تو انسان اسے مقصد کا جبر قرار دیتا ہے اور مقدر کو مطعون کرتا ہے۔ غور کیا جائے، تو احساس ہوگا کہ کامیابی بھی آزمائش ہے اور ناکامی بھی...... کامیابی غرور کے بجائے شکر، عجز اور اطاعت میں بدل جائے تو آزمائش میں سرخرو ہوئے، اگر غرور کا رنگ چھا جائے تو ناکام ٹھہرے۔ ناکامی اور محرومی میں صبر کیا تو ناکامی ایک دن بہت بڑی کامیابی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، اگر مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر پڑے، خالق سے مایوس ہو کر گلے شکوے اور شکایات کے دفتر کھول لیے تو پھر ناکامی کی تاریکی پھیلتی ہی رہتی ہے۔ علم ان معنوں میں آزمائش قرار پائی، اگر علم کو شیطانی حربوں کے لیے استعمال کیا تو آزمائش میں ناکام ہوئے اور اگر علم کو رحمانی کاموں کے لیے استعمال کیا تو زندہ جاوید ہو گئے۔ بات دیکھنے، سوچنے، غور و فکر کرنے اور اپنے رَبّ سے راہنمائی حاصل کرنے کی ہے اور اگر انسان قدرت کے بھید اور زندگی کے راز سمجھنے کے لیے تھوڑا سا غور کرے تو محسوس ہوتا ہے کہ اقتدار، اختیار، دولت، علم، حسن، عہدے، صحت، شہرت وغیرہ وغیرہ سب آزمائشیں ہیں اور اسی طرح غربت، مصیبت، محرومیاں، ابتلا، ناکامیاں، بیماریاں وغیرہ بھی آزمائشیں ہیں۔ گویا پوری زندگی آزمائش اور امتحان ہے اور اس امتحان یا آزمائش میں کامیابی اور سرخروئی کا انحصار کافی حد تک انسان کی اپنی ذات پر ہے کہ وہ کیا کردار، اخلاق، رویہ اور انداز اپناتا ہے۔

Marfat.com

مرشد اور مرشدِ کامل (1)

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ مرشد روحانی راہنما ہوتا ہے اور مرشد کامل وہ روحانی راہنما ہوتا ہے، جو اپنے مریدوں یا چاہنے والوں کے احوال پر نہ صرف نگاہ رکھے، بل کہ ان کے معاملات سے بھی آگاہ رہے، کیوں کہ اس کے بغیر روحانی تربیت کا عمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنے حلقے کے اراکین کی قلبی کیفیات پر نگاہ صرف ایسا شخص ہی رکھ سکتا ہے، جس میں قلب پر نگاہ رکھنے کی صلاحیت اور اہلیت ہو۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ یہ قوت اور نظر صرف اپنے پیاروں کو عطا فرماتے ہیں، یہ ہر کسی کا خاصا نہیں ہوتا۔ یہ وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جادو، ٹوٹکے، ٹونے اور تعویذات کا روحانی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض شعبدہ بازی ہے، جو کمزور ایمان اور ضعیف اعتقاد والے مجبور لوگوں سے پیسے بٹورنے کا کھیل ہوتا ہے، ورنہ میں نے زندگی بھر کسی روحانی شخصیت کو وظائف کی قیمت وصول کرتے نہیں دیکھا۔ ہاں یہ بھی یاد رکھیں کہ حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں واضح کیا ہے کہ روحانی شخص، فقیر اور ولی ہمیشہ پابند شریعت ہوتا ہے، اس لیے اس معیار کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ولی اللہ نہ خود شریعت کی حدود سے باہر جاتا ہے، نہ ایسے کام کرنے کا حکم دیتا ہے، جن سے شریعت کی حدود مجروح ہوتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے، یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ مرشد یا ولی اللہ حالات سے آگاہی کے باوجود نہ کبھی ماضی کی کتاب کھولتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے نقشے بناتا ہے، جہاں ضروری ہو وہ ہمیشہ بات اشارے کنایے کی زبان میں کرتا ہے۔ میں نے زندگی کے سفر میں پامسٹری، نجوم اور علم جعفر کے ایسے ماہرین دیکھے، جو ماضی کا حال اس طرح بیان کرتے کہ انسان حیرت کی وادیوں میں گم ہو جاتا، لیکن یاد رکھیے کہ یہ لوگ ہرگز روحانی شخصیت نہیں تھے۔ اس لیے، اگر کوئی آپ کو

Marfat.com

متاثر کرنے کے لیے ماضی کے اوراق بے نقاب کرنا شروع کر دے یا مستقبل کے بارے میں پشین گوئیوں کے ڈھیر لگا دے، تو اسے ہرگز روحانی شخصیت نہ سمجھیں، کیوں کہ میرے تجربے اور مشاہدے کے مطابق اولیاے کرام اس طرح کی دکان داری نہیں کرتے، اگر کسی کو آنے والی آفت سے بچانا مقصود ہو، تو بات اشاروں میں بیان کی جاتی ہے۔ دکان داری جس کی سمجھ وقت گزرنے کے بعد آتی ہے کہ ایسا کرنے کا حکم کیوں دیا گیا تھا۔ ہاں کچھ صاحبان باطن صرف ایسے مخصوص حضرات سے مستقبل کی باتیں شیئر کر لیتے ہیں، جن سے ان کا قلبی و روحانی رشتہ ہو، لیکن اس کے لیے انھیں اپنے ''شیخ'' سے اذن لینا پڑتا ہے۔ علم نجوم یا علم جفر کا ماہر ہونا بعض اوقات انسان کے لیے عذاب اور وبال کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ طویل عرصہ قبل میں اپنے بے تکلف دوست چودھری سردار محمد آئی جی پولیس پنجاب کے دفتر میں بیٹھا تھا، تو ان سے ملنے ان کا ایک دیرینہ شناسا آیا، جس کا تعلق سرگودھا کے کسی دیہات سے تھا۔ اس کے نام کی چٹ دیکھ کر جب چودھری صاحب نے اسے اندر بلایا تو مجھے بتایا کہ یہ ملاقاتی علم نجوم اور علم جفر کا ماہر ہے اور جو کچھ بتاتا ہے صحیح نکلتا ہے۔ وہ شخص آیا اور کرسی پر بیٹھ کر دو چار باتیں کرنے کے بعد رونے لگا۔ چودھری صاحب نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا ''چودھری صاحب میں آپ سے آخری دفعہ ملنے آیا ہوں۔ میرے حساب کے مطابق میں اپنے آپ کو چند دنوں کے بعد دنیا میں نہیں دیکھتا۔ میرا دانہ پانی ختم ہو چکا ہے،، بس آج آپ مجھے میرے گاؤں میں پروٹوکول کے ساتھ بھجوائیں۔ مختصر یہ کہ چودھری صاحب نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ پولیس کی گاڑی اسے گاؤں چھوڑ آئی۔ کوئی پانچ چھ روز بعد چودھری صاحب نے مجھے بتایا کہ اس شخص کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس طرح کے بہت سے واقعات کا میں عینی شاہد ہوں کہ کسی پامسٹ، علم نجوم کے ماہر نے جو کچھ بتایا وہ صحیح نکلا، لیکن یاد رکھیں یہ نہ ہی روحانیت ہے اور نہ ہی اولیاے کرام کا وطیرہ......اولیاے کرام اللہ والے ہوتے ہیں، ان کی مجلس میں ایک ادب، تقدس اور رعب داب طاری رہتا ہے اور یہ سب کچھ قدرتی ہوتا ہے، بناوٹی ہرگز نہیں، چاہے ولی اللہ بہ ظاہر غربت، حسرت اور لاچاری کا نمونہ ہی نظر آتا ہو۔ اس کی مجلس میں بادشاہ وقت بھی مؤدب بیٹھتا اور ہمہ تن گوش رہتا ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ مخلوق کے گناہوں اور کمزوریوں پر حتی الوسیع پردہ ڈالتے ہیں اور یہی انداز انبیاے کرام کا رہا ہے اور اسی روایت کو اولیاے کرام نبھاتے ہیں۔ میں ان تجربات سے گزرا ہوں کہ مرشد کو حلقہ ارادت کے کسی رکن کی بڑی کمزوری کا راز معلوم ہو گیا اور کبھی کبھار یہ اطلاع روحانی چینل سے ملی، لیکن انھوں نے کبھی اس راز کو ہوا تک نہ لگنے دی اور نہ اس شخص کو کبھی اس کا احساس ہی ہونے دیا۔ آج سے ساڑھے تین

Marfat.com

دہائیاں قبل میں ایک ولی کامل کے ہاں تواتر سے حاضری دیا کرتا تھا۔ ان سے محبت سی ہوگئی تھی، جو مجھے اکثر شام کے وقت ان کے پاس کھینچ کر لے جاتی تھی۔ میرا مزاج کچھ ایسا ہے کہ میں اندر سے باغی واقع ہوا ہوں، اس لیے مزاجاً مرید قسم کا انسان نہیں۔ شاید اسی لیے اولیائے کرام کی جوتیاں سیدھی کرنے کے باوجود محروم رہا۔ میری ان سے نہایت مؤدب دوستی ہوگئی تھی اور وہ مجھ پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ بہت سے واقعات آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا، فی الحال صرف ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں، جس کا میں شاہد ہوں، وہ مجھ سے کبھی کبھار کہا کرتے تھے کہ تمھارے علاوہ میرے پاس تمام حضرات دنیاوی اغراض کے لیے آتے ہیں، صرف تم روحانی فیض کی خواہش لے کر میرے پاس آتے ہو، لیکن تم بہت دیر سے آئے ہو، اب میرے پاس دینے کو کچھ نہیں رہا۔ وہ نہایت نرم گفتگو کیا کرتے تھے تاکہ کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ شاید وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ تم اس قابل نہیں کہ روحانی فیض حاصل کرسکو، لیکن اسی بات کو وہ یوں کہتے کہ اب میرے پاس دینے کو کچھ نہیں رہا۔ ایک بار ہم تنہا بیٹھے تھے۔ کہنے لگے ڈاکٹر صاحب کیا کروں۔ یہ لوگ میرے پاس دنیاوی مفادات کی خاطر آتے ہیں۔ ان کی بات نہ سنوں یا نہ ملوں تو ''آگے'' سے مار پڑتی ہے اور اگر سنوں تو کچھ کر نہیں سکتا۔ کہنے لگے وہ چھوٹا سا صنعت کار جو سامنے مسجد میں نماز ادا کر رہا ہے، میرے پاس دنیا کمانے آتا ہے۔ ایک راز جو اس کے سینے میں قید ہے اور جس کا کسی کو علم نہیں، وہ یہ ہے کہ وہ ایک حسین عورت کی اندھی محبت میں گرفتار ہے، جو اس کے وجود پر بری طرح چھائی ہوئی ہے۔ بیوی کے ڈر سے اُس سے شادی نہیں کرتا، لیکن اسے دل سے نکال بھی نہیں سکتا۔ میں نے یہ بات سنی اور دل کے نہاں خانے میں دفن کر دی۔ اُس ولی اللہ کا وصال ہوگیا۔ کئی برس بعد اُس صنعت کار کی محبت کا راز کھلا تو تصدیق ہوگئی۔

جوانی کے دور میں میرا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ میرے ہمدرد شناساؤں میں ایک ایسا ماہر علم نجوم بھی تھا، جو یہ تک بتا دیتا کہ جی ٹی روڈ پر اسلام آباد جاتے ہوئے اتنے فاصلے کے بعد یا فلاں مقام پر بارش کے چھینٹے پڑنے کا امکان ہے۔ مخول مخول میں زائچہ سامنے رکھ کر اُس نے مجھے بعض ایسی باتیں بتائیں، جو چند برس بعد سچی ثابت ہوئیں، لیکن میں کبھی بھی اتنا ضعیف الاعتقاد نہیں تھا کہ اسے ولی اللہ جانتا، نہ ہی کبھی اُس نے ایسا دعویٰ کیا۔ مذہب یا شریعت اس کے پاس سے بھی نہیں گزری تھی۔ اس کا انتقال ہوئے تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزرا۔ ایک ایسا باریش پابندِ صوم وصلوٰۃ بھی دیکھا، جس نے عملیات کے ذریعے جن کو قابو کیا ہوا تھا۔ تجربات کی تفصیل لکھوں تو کئی قسطیں بنتی ہیں، لیکن ان کا نچوڑ نقطہ

Marfat.com

اتنا سا ہے کہ ماہرین علم نجوم وجفر اور پامسٹ روحانی شخصیات نہیں ہوتے۔ان کی بہت سی باتیں غلط اور اندازے ہوائی ہوتے ہیں، جب کہ ولی اللہ،اول تو راز سے پردہ اُٹھاتا نہیں،اگر ان کے منہ سے کوئی بات نکل جائے،تو وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔جادو،ٹونے،ٹوٹکے اور اس طرح کی عملیات کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں، یہ محض شعبدہ بازی اور دکان داری ہے اور ان کے جھانسے میں آنا ضعیف الاعتقادی ہے،جس سے دین اسلام میں منع کیا گیا ہے،بل کہ یہاں تک حکم ہے کہ کسی ایسے شخص سے حال معلوم کرنے والے کی مخصوص مدت تک نماز ہی نہیں ہوتی۔ باباجی کہا کرتے تھے کہ ولی اللہ ایسا شخص ہوتا ہے،جس کی مجلس میں بیٹھ کر طبیعت عبادت کی جانب مائل ہو اور قلب ذکر الٰہی کرنے کو چاہے،اگر کسی مجلس میں یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تو یقین رکھیے کہ وہ شخص ولی اللہ ہرگز نہیں ہے۔لکھنا تھا مرشد اور کامل مرشد پر،لیکن بات اِدھر اُدھر نکل گئی۔یہ اُدھار ہے پھر کس روز اپنے تجربات کی روشنی میں اس موضوع پر طبع آزمائی کروں گا۔

انشاالله، انشاالله۔

Marfat.com

مرشد اور مرشدِ کامل (II)

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ مرشد وہ نیک، زاہد و عابد، پابند شریعت اور روحانی شخصیت ہوتی ہے، جو آپ کی روحانی تربیت کرے، باطن کی صفائی کرے اور آپ کو اللہ اور رسول ﷺ کی محبت کا اسیر بنا دے ، جب کہ مرشد کامل وہ ہستی ہوتی ہے، جو ان کاموں کے علاوہ آپ پر نگاہ رکھے، آپ کے احوال سے آگاہ رہے اور آپ کو بھٹکنے سے روکے۔ دنیاوی مراتب کے مانند روحانی دنیا میں بھی اپنا اپنا مرتبہ اور مقام ہوتا ہے، اس لیے ہر روحانی شخصیت میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مریدوں کے احوال پر نگاہ بھی رکھ سکے۔ اسی طرح ہر روحانی شخصیت کی فیض بخشنے کی بھی اپنی اپنی صلاحیت ہوتی ہے، مطلب ہر روحانی شخصیت میں اتنی ''طاقت'' نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مرید کو روحانی فیض دے سکے۔ یہ اپنے اپنے درجے، اپنے اپنے مقام اور اپنے اپنے مرتبے ہیں، جو محنت، عبادت، زہد، تقویٰ اور نظرِ شیخ سے حاصل ہوتے ہیں۔ میرا ایک روحانی شخصیت سے بیس برس تک دوستانہ رہا، میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے ان کی ان گنت چھوٹی چھوٹی کرامات دیکھیں، وہ سرتاپا نیم جذب کی کیفیت میں رہتے اور ان کا باطن ہمہ وقت روشن اور زندہ رہتا، لیکن وہ نہ کسی کو روحانی فیض دے سکتے تھے اور نہ ہی اپنی روحانیت کسی کو منتقل کر سکتے تھے۔ مجھے ہرگز علم نہیں، کیوں کہ میں اندر باہر سے اندھا ہوں، لیکن وہ کبھی کبھی سکون کے لمحوں میں مجھے بتایا کرتے تھے کہ مجھے حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش سے فیض ملا ہے اور یہ اُن کے الفاظ تھے کہ میری باگ داتا صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ میں اتنی نیک، پابند شریعت، زاہد و عابد اور عشق رسول میں مگن شخصیت سے یہ ہرگز توقع نہیں کر سکتا کہ وہ مجھ جیسے کاسہ لیس سے غلط بیانی کریں گے، نہ ہی اس کی انہیں ضرورت تھی۔ وہ ہر جمعرات داتا صاحب جایا کرتے تھے۔ چند ایک بار راز و نیاز کے ماحول میں،

Marfat.com

میں نے ان سے پوچھا کہ جب آپ داتا صاحب تشریف لے جاتے ہیں، تو کیا صاحب مزار سے ملاقات ہوتی ہے، انھوں نے اپنی نیم وانیم جذب آنکھوں کو قلب پر جماتے ہوئے جواب دیا ''ہاں بابا ہوتی ہے۔'' میں دنیادار، دنیا کی غلاظتوں میں لتھڑا ہوا کیا جانوں کہ یہ ملاقات کیا ہوتی ہے، لیکن مجھے ''ارب فیصد'' یقین ہے کہ بابا الفاظ میں ملاوٹ سے پاک تھا۔ وہ تو اتنا معصوم شخص تھا کہ اسے ہیر پھیر اور دنیاوی معاملات کا مطلق علم ہی نہیں تھا۔ یقیناً ان کا اپنا روحانی مقام ہوگا، لیکن وہ کسی کو فیض یاب کرنے یا اپنی روحانی طاقت میں کسی کو شریک کرنے کے اہل نہیں تھے۔ شاید جس کے ہاتھ میں ان کی باگ تھی، وہیں سے یہ پابندی بھی عائد ہوئی تھی۔

بات ذرا دُور نکل گئی۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ مرشد روحانی تربیت کرتا، نیکی کی راہ پر لگاتا اور برائی سے دور بھگاتا ہے، لیکن مرشد کامل تربیت کے مراحل مکمل کر کے روحانی فیض بھی دیتا ہے اور روحانی فیض عطا کرنے کے لیے مرید کے احوال پر نگاہ بھی رکھتا ہے، جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ یہ مقام انھی کا ہوتا ہے، جنھیں رب یہ مقام عطا کرتا ہے۔ میں روحانی دنیا کے راز و نیاز سے بالکل آگاہ نہیں، لیکن لگتا ہے کہ اس دنیا میں بھی فیض دینے اور فیض لینے کے کچھ رولز یا قواعد ہیں، جن کی پابندی کے بغیر انسان محروم رہتا ہے۔ ہاں ایک قسم ان لوگوں کی بھی ہے، جن کے مقدر میں ازل سے یہ لکھتا ہوتا ہے اور یہ بھی طے ہوتا ہے کہ انھیں یہ روشنی کہاں سے ملے گی، اسی لیے کبھی کبھی صاحبان نگاہ انھیں حکم دیتے ہیں کہ تم فلاں جگہ فلاں شخص کے پاس چلے جاؤ، لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کیوں جاؤ۔ روحانی دنیا اشاروں کنایوں کی دنیا ہے۔ صاحبان نگاہ، صاحبان اطلاع بھی ہوتے ہیں، جن پر ان کی نگاہ ہوتی ہے، ان کی انھیں اطلاع بھی ہوتی ہے۔ میں جب بھی سرگودھا میں اپنے مرشد میاں عبدالرشید قلندر شہید کی خدمت میں حاضر ہوتا، تو وہاں پہنچ کر پتا چلتا کہ میاں جی کو میری آمد کی پہلے سے خبر تھی اور وہ صبح ہی کہہ رہے تھے کہ لاہور سے باؤ آ رہا ہے، چائے کھانے کا بندوبست رکھنا، حالاں کہ میں اس پروگرام کو سختی سے اپنے تک محدود رکھتا تھا۔ میاں جی دنیاوی تقاضوں سے آزاد اور پاک تھے۔ نہ شادی نہ بال بچوں کے جھنجٹ۔ قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد اور اس کے ساتھ دو کمروں میں ان کا ٹھکانہ تھا اور کل جائیداد دو جوڑے کپڑے تھی، کیوں کہ جوتی وہ پہنتے نہیں تھے، لیکن رعب دبدبہ کا یہ عالم کہ کسی کو دم مارنے کی جرات نہیں ہوتی تھی اور نہ کوئی ان کی مرضی کے بغیر ان کے قریب جا سکتا تھا۔ دن بھر مسجد کی صفائی اور غسل خانوں کے غسل میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ولی کامل اور مرشد کامل تھے، لیکن اپنے آپ کو کبھی ظاہر نہ ہونے دیتے۔ ''کرامت'' کا تو

Marfat.com

سوال ہی نہیں۔ سب کچھ جاننے کے باوجود لاعلمی...... اس کے برعکس آپ کسی شعبدہ باز یا ماہر علم نجوم یا عامل وغیرہ کے پاس جائیں، تو وہ آپ کے ماضی کی کتھا سنا کر آپ کو متاثر کرنے کے چکر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کبھی پرانے زمانے میں وزیر آباد میں ایک ایسا شخص پایا جاتا تھا، جو آنے والے کا نام لکھ کر کاغذ کو دانتوں میں دباتا اور اس کا ماضی واحوال بیان کرنے لگتا۔ میرا ایک سکول فیلو اور یار ایسا بھی ہے، جس کے ذہن میں زائچہ اس طرح فٹ ہے جس طرح فریم میں تصویر لگی ہوتی ہے۔ وہ ظالم کبھی کبھی ایسی بات کر دیتا ہے، جو من وعن درست نکلتی ہے، لیکن اکثر اوقات ایسی ''یاوایاں'' مارتا ہے، جن کا کوئی نام ونشان تک نہیں ملتا۔ پنجابی میں ''یاوی'' گپ، یا بے بنیاد بات کو کہتے ہیں۔ میں کئی برس سے اُس سے نہیں ملا، لیکن آج سے اٹھارہ برس پہلے کا ایک واقعہ اس وقت میری یادداشت کی کھڑکی پر دستک دے رہا ہے، جسے بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں ان صاحب سے ملنے گیا تو میرا چھوٹا سا بیٹا بھی میرے ساتھ تھا۔ گپ شپ کے دوران میری بیٹی کا ذکر ہوا تو میں نے کہا کہ وہ چند دنوں سے علیل ہے، بخار نہیں اُتر رہا۔ اس نے چمک دار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ اس کے بستر کی چادر نیلی ہے اور تکیے کا غلاف بھی نیلا ہے۔ اسے اس رنگ سے الرجی ہے۔ چادر تکیہ بدل دیجیے بخار اُتر جائے گا۔ میرا بیٹا چچا کے گھر کے پکوڑے کھا رہا تھا۔ اس نے پکوڑا پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا کہ فوراً گھر چلیں۔ میں گھر واپس آیا، تو وہ تیزی سے کار سے نکل کر دوڑتا ہوا بہن کے کمرے میں گیا اور چلانے لگا کہ ہاں اس کے بستر کا رنگ سچ مچ نیلا ہے۔ چادر تکیہ بدلا تو اس کا بخار اُتر گیا۔ کوئی اٹھارہ برس قبل ایک روز باتوں باتوں میں، میں نے اس سے ذکر کیا کہ میں اپنی کار بیچنے کے چکر میں ہوں۔ کہنے لگا پرسوں ایک موٹا سا شخص تمھارے گھر آئے گا اور تمھاری توقع سے تھوڑے زیادہ پیسے دے جائے گا۔ میں گھر کے لان میں بیٹھا تھا تو کار ڈیلر ایک شخص کے ساتھ آیا۔ اس موٹے شخص نے کار دیکھی، ٹرائی لی اور خرید کر لے گیا۔ عیاش جرنیل پرویز مشرف نے بہ حیثیت صدر قوم سے خطاب کرنا تھا۔ خبریں تھیں کہ یہ اس کا آخری خطاب ہے اور جنرل استعفیٰ دے رہا ہے۔ میں نے اپنے اس دوست کو فون کیا اور پوچھا کہ بتاؤ مشرف استعفیٰ دے گا یا نہیں۔ اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا کہ وہ ہرگز استعفیٰ نہیں دے گا اور پندرہ منٹ بعد جب مشرف نے قوم سے خطاب کیا تو استعفے کا اعلان کر دیا۔ کچھ باتیں درست، بل کہ حیرت ناک حد تک درست اور اکثر اندازے غلط اور خوفناک حد تک غلط۔ یہ ہے علم نجوم، پامسٹری، عملیات وغیرہ خدارا ایسے شعبدہ بازوں کو روحانی شخصیت ہرگز نہ جانو۔ روحانی دنیا میں اس طرح کے شعبدے، ڈرامے، انکشافات وغیرہ نہیں ہوتے۔ روحانی لوگ ظاہر نہیں

Marfat.com

وں کے ہاتھوں لٹتے اور گھر تباہ کرتے دیکھتا ہوں، تو بڑی

وئی تھی مرشد اور مرشد کامل کے حوالے سے، لیکن پھر دنیاوی

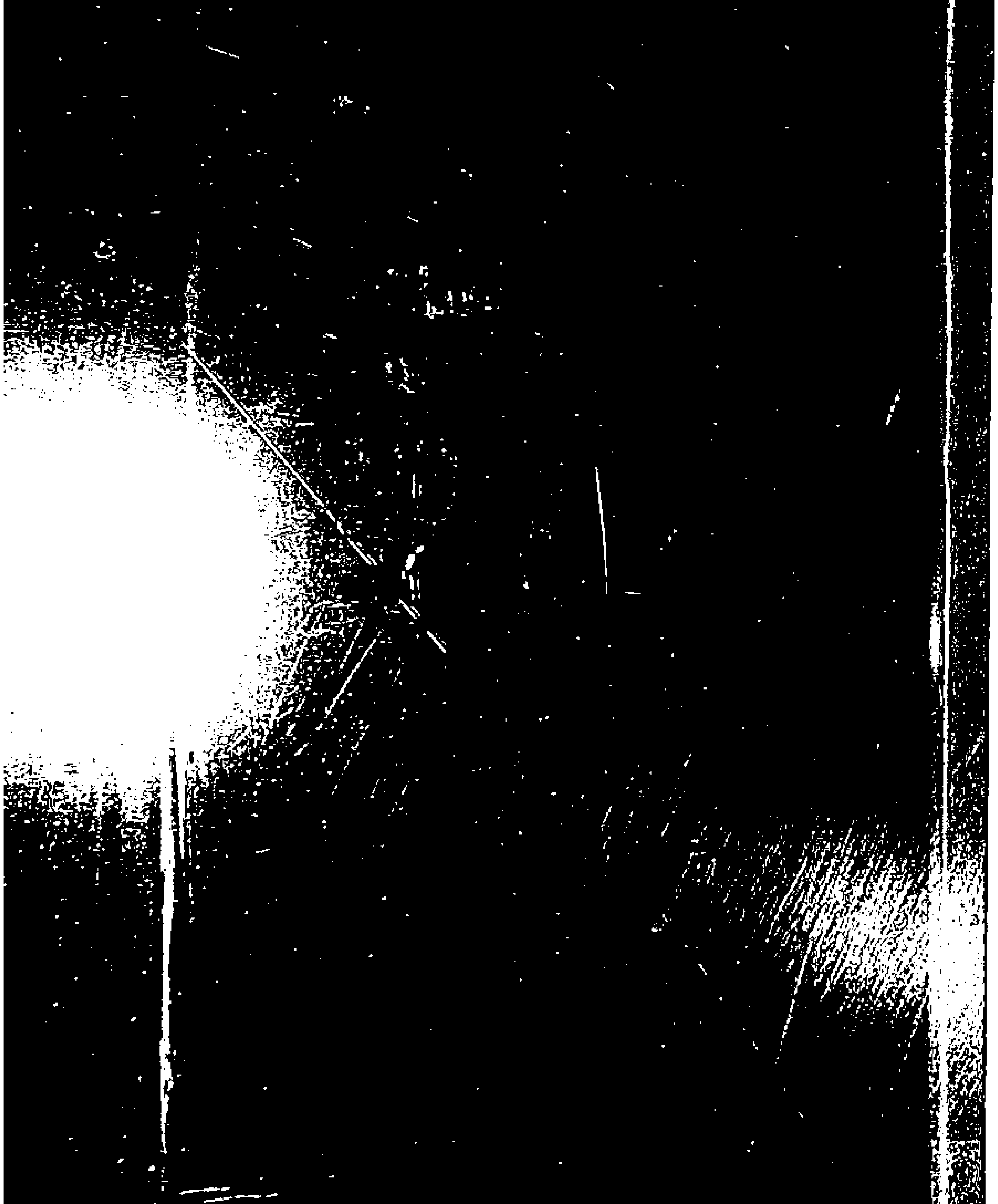

Marfat.com

مرشد اور مرشدِ کامل (III)

کچھ تجربات اتنے ذاتی ہوتے ہیں کہ انسان انھیں انمول خزانے کے مانند چھپا کر رکھتا ہے اور اظہار سے گریز کرتا ہے۔ میں بھی اس موضوع پر لکھتے ہوئے اپنے ذاتی تجربات ہرگز بیان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس احساس نے مجبور کر دیا کہ انھیں لکھے بغیر بات واضح نہیں ہوگی اور نہ ہی مرشد کامل کا تصور سمجھ میں آئے گا۔ کچھ دوستوں کا اصرار بھی ہے کہ ''من بیتی'' کی جھلک دکھائی جائے۔ ایک طرف قارئین کی ایک بڑی تعداد روحانی تشنگی کی تڑپ میں مبتلا ہے، تو دوسری طرف روحانیت کے منکر بھی ایک طاقت ور گروہ کی صورت میں جلوہ گر ہیں، لیکن میں خلوص نیت سے محسوس کرتا ہوں کہ یہ سارا قضیہ اور سارا معاملہ ذاتی تجربات کا ہے۔ زندگی کی مادیت میں، غرض جن حضرات کو نہ کبھی روحانی شخصیات کی تلاش رہی، نہ کبھی روحانی تشنگی محسوس ہوئی اور نہ ہی کبھی معمولی روحانی تجربے کی لذت حاصل ہوئی، وہ اس سے انکار نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے؟ کیوں کہ ان کی کل کائنات اور پوری دنیا محض مادیت تک محدود ہے۔ ایسے ذہین و فطین لوگوں کو ہزار سمجھائیں یہ باتیں اُن کے سر کے اوپر سے گزر جائیں گی اور وہ انھیں طنز و تحقیر کا نشانہ بناتے رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے موضوعات صرف ان لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں، جن میں روحانی تشنگی موجود ہو اور جن کی روح مادیت کے بوجھ تلے دب کر اپنی روشنی کھو نہ چکی ہو۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ مرشد ایسی ہستی کو کہتے ہیں، جو آپ کی روحانی تربیت کرے اور اللہ سبحانہ تعالیٰ اور اللہ پاک کے محبوب نبی کریمؐ سے قرب حاصل کرنے کا راستہ بتائے۔ ظاہر ہے اس منزل سے قبل باطنی صفائی ناگزیر ہوتی ہے اور باطنی صفائی کے لیے کچھ وظائف و مجاہدات بھی کرنے پڑتے ہیں۔ دراصل یہ روحانی تربیت کا حصہ ہوتے ہیں، لیکن مرشد کامل وہ ہستی ہوتی ہے، جو انسان کی

127907

Marfat.com

کو کوئی بہت بڑا ولی اللہ ہی قابو کر سکتا تھا۔ سردار صاحب کے پاس جانا بہانہ بنا اور میرا کاکا جی سے قلبی محبت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ کاکا جی کو اپنے والد گرامی سے روحانی فیض حاصل ہوا تھا، لیکن وہ نہ ظاہر کرتے تھے اور نہ ہی ظاہر ہونے دیتے تھے۔ ایک کشش تھی، جو مجھے ہر شام ان کے پاس کھینچ کر لے جاتی تھی۔

بہت سی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے مرشد کامل کا تصور واضح کرنا مقصود ہے۔ مجھے ان کے پاس حاضری دیتے تقریباً دو سال گزر چکے تھے۔ جوانی کا دور تھا ایک دن الارم کے باوجود فجر کی نماز کے وقت آنکھ نہ کھلی اور نماز قضا ادا کی۔ دوسرے روز بھی یہی ہوا، چناں چہ دوسرے روز جب میں گھر سے دفتر جانے کے لیے روانہ ہوا تو خلاف معمول شدید کشش محسوس ہوئی اور میں نے کار کا رُخ کاکا جی ہاؤس کی جانب موڑ دیا۔ کاکا جی صبح نہیں ملتے تھے، کیوں کہ وہ وظائف، ذکر اذکار میں مصروف رہتے تھے۔ وہاں پہنچا تو حیرت ہوئی کہ کاکا جی سڑک پر نظریں لگائے دروازے پر کھڑے تھے۔ چند منٹ اِدھر اُدھر کی گفتگو کرنے کے بعد اشارۃً ''ڈاکٹر صاحب ہر شے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ فوجیں صبح صبح جھنڈے کو سلامی دینے آتی ہیں۔ جب وہ سلامی دے کر چلی جائیں، وقت گزر جائے تو وہاں جانے کا کیا فائدہ؟'' میں سمجھ گیا اشارہ کس طرف ہے۔ اکثر چپ رہا کرتا تھا، لیکن اس روز صبر نہ ہو سکا۔ میں نے پوچھا سرکار آپ کو کیسے علم ہوا کہ دو دن سے میری نماز فجر قضا ہو رہی ہے۔ فرمایا میں تو یونہی بات کر رہا تھا۔ مجھے کیا پتا؟ یہ ایک انداز ہوتا ہے تنبیہ کرنے اور احوال پر نظر رکھنے کا۔ کاکا جی عام طور پر کسی کے گھر نہیں جاتے تھے۔

ایک روز میرے ہاں آئے، میں مؤدب پاس بیٹھا تھا۔ وہ جھکے اور قالین پر اُنگلی سے گول دائرہ بناتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے''۔ اور وہ جگہ وہ تھی، جہاں جائے نماز پر نماز کے دوران سجدہ کرتے ہوئے، اکثر میرا ماتھا زمین پر لگتا تھا۔ یہ ایسی حقیقت تھی، جس کا صرف مجھے ہی علم تھا۔

مقصد آپ پر اپنی پارسائی کی دھاک بٹھانا نہیں۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ مقصد آپ کو یہ بتانا ہے کہ مرشد کامل اپنے مرید کے معاملات سے کس طرف آگاہ رہتا ہے۔ انھی دنوں میرا پنڈی کے ایک بزرگ اور کاروباری شخصیت سے یارانہ ہو گا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ایس لکھتے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ وہ سید ہیں۔

میں کئی روز کاکا جی کے ہاں حاضری نہ دے سکا۔ ایک شام حاضر ہوا تو انھوں نے خفگی کا اظہار بالکل نہیں کیا، کیوں کہ یہ لوگ بے نیاز ہوتے ہیں۔ پہلی دفعہ کھل کر بات کی اور کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ جس کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور اسے سید سمجھتے ہیں وہ دراصل شیخ ہے۔ میں نے تحقیق کی تو ان کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ ایسے تجربات اور واقعات کی ایک قطار ہے، جو میرے ذہن پر دستک دے رہی ہے، لیکن

Marfat.com

Marfat.com

مرشد اور مرشدِ کامل (17)

یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ روحانی دنیا کے رشتے حد درجہ خلوص، محبت اور عقیدت کے رشتے ہوتے ہیں، جنھیں آپ قلبی یا روحانی رشتے بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان رشتوں پر، اگر دنیاوی غرض، ریاکاری یا لالچ وغیرہ کا سایہ پڑ جائے تو اُن کی روح مجروح ہو جاتی ہے۔ روحانی رشتوں کی فیض یابی کے لیے رزق حلال کی نعمت نصیب ہونا، شراب نوشی اور دوسرے کبیرہ گناہوں سے اجتناب ضروری ہے، اگر انسان کی روح کثیف ہو اور دنیاوی آلائشوں کے بوجھ تلے دبی ہو، تو نہ مرشد کی نگاہِ محبت نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی روحانی رشتے پھلتے پھولتے اور ثمر آور ہوتے ہیں۔ مرشد کی تلاش اور تمنا، اگر نہایت خلوص اور اعلیٰ ترین جذبے کی پیداوار ہو تو اللہ پاک رستے ہموار کر دیتے ہیں، لیکن یہ عمل قدرے طویل اور صبر آزما ہوتا ہے، جو متلاشی صبر اور آزمائش کی وادیوں سے گزرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، وہ اکثر ناکام رہتا ہے اور اپنی قسمت کو مطعون کرتا رہتا ہے، اگر مرشد کی نگاہ نصیب ہو جائے، جو روح اور باطن کی پاکیزگی اور سچی لگن کے نتیجے کے طور پر ملتی ہے، تو مرشد اور مرید کا تعلق ایک طرح سے باہمی عشق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے اولیائے کرام اور صوفیائے کرام اپنے اپنے مرشد کے عشق میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ حضرت سلطان باہو سے لے کر صوفی شاعر میاں محمد تک سبھی کے کلام پر مرشد چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ سبحان اللہ میاں محمد صاحب کا وہ شعر مرشد کی شان اور مقام نہایت آسان انداز سے واضح کرتا ہے:

میں گلیاں دا روڑا کوڑا۔

مینوں محل چڑھایا سائیاں، مطلب یہ کہ میں تو گلی کا کوڑا تھا، مرشد نے محل میں بٹھا دیا۔ یہ مرشد کی نگاہ کا فیض ہوتا ہے، جو انسان کی کایا پلٹ دیتا ہے اور وہ اپنے کمرے یا حجرے میں جائے نماز پر

Marfat.com

بیٹھا ساتوں آسمانوں اور مقامات مقدسہ کی زیارت کر کے واپس لوٹ آتا ہے۔ اس پر کائنات کے راز کھلنے لگتے ہیں اور اس کی نگاہ مادی پابندیوں اور دنیاوی حدود و قیود سے آزاد ہو جاتی ہے۔ وہ گلیوں کا پاؤں تلے روندا جانے والا بدبودار کوڑا ہوتا ہے، جسے مرشد کی نگاہ نہایت خوب صورت اور دلفریب محل میں بیٹھا دیتی ہے۔

اس لیے جب روشن خیال یا ترقی پسند لبرل لکھاری روحانیت کو چورن بیچنے سے تشبیہ دیتے ہیں، تو میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا، کیوں کہ یہ اپنے اپنے تجربات کی بات ہے۔ جس شخص نے پیرس نہیں دیکھا، آپ اسے لاکھ سمجھائیں کہ ایفل ٹاور اس طرح کا ہے اور ایسا ہے، وہ نہیں سمجھ سکتا۔ جس شخص میں کبھی رومانیت کی لگن ہی نہیں رہی یا جسے کبھی مرشد نصیب ہی نہیں ہوا یا جسے کبھی کسی ولی اللہ کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا وہ بیچارا معصوم کیا جانے کہ روحانی دنیا کی رمزیں، عشق اور لگن کیا شے ہوتی ہے اور روحانی تجربہ کیسے کہتے ہیں۔ میں نہایت دنیادار انسان ہوں۔ مجھے خود بھی روحانیت کا کچھ پتا نہیں۔ میں زندگی کی اُس سٹیج پر ہوں، جہاں انسان قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوتا ہے اور خاصی حد تک دنیاوی رنگینوں، اغراض اور ترجیحات سے تائب ہو جاتا ہے۔ میں تو فقط اپنے تجربات بیان کرتا ہوں، ورنہ مجھے دنیا اور آپ سے کیا لینا دینا۔ غلط بیانی بےلذت گناہ ہوتی ہے۔ اعمال نامے کو بےلذت گناہ سے کیوں کر آلودہ کیا جائے، جب کہ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ بخشش اور مغفرت آخری منزل اور خواہش ہوتی ہے، اس لیے نظر اس منزل پر رہنی چاہیے، چناں چہ میں ان حضرات کے لیے لکھتا ہوں، جو اس راہ کے راہی ہیں اور متلاشی ہیں، نہ کہ ان حضرات کے لیے جو چورن بیچتے یا چورن کھاتے ہیں۔

میں اس سے قبل ذکر کر چکا ہوں کہ میرے مرشد میاں عبدالرشید قلندر تھے، جن کا وصال 1994ء میں ہو گیا تھا۔ ان سے قبل اور ان کے بعد بھی مجھے اولیائے کرام سے تعلق کا شرف حاصل رہا، لیکن محدود پیمانے پر۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ان کے وصال کے بعد جن صاحبان نظر سے رابطہ ہوا، وہ شاید انھی کی نظر کا فیض تھا، کیوں کہ جھجکتے ہوئے عرض کروں کہ کم سے کم ایک صاحب باطن نے مجھ سے کہا کہ تمھارے شہید مرشد نے مجھے یہ فرض سونپا ہے، حالاں کہ ان کی آپس میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ مرشد غائب ہو کر بھی حاضر رہتا ہے شرط یہ ہے کہ تعلق سچا، قلبی اور روحانی ہو۔ یہ ایک عجیب قسم کا عشق اور کیفیت ہے، جسے محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن وضاحت نہیں ہو سکتی۔

میاں رشید صاحب سے زیادہ بےغرض، نفس پر غالب اور صوفی منش انسان میں نے نہیں دیکھا۔

Marfat.com

کو کوئی بہت بڑا ولی اللہ ہی قابو کر سکتا تھا۔ سردار صاحب کے پاس جانا بہانہ بنا اور میرا کا کا جی سے قلبی محبت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ کا کا جی کو اپنے والد گرامی سے روحانی فیض حاصل ہوا تھا، لیکن وہ نہ ظاہر کرتے تھے اور نہ ہی ظاہر ہونے دیتے تھے۔ ایک کشش تھی، جو مجھے ہر شام ان کے پاس کھینچ کر لے جاتی تھی۔ بہت سی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے مرشد کامل کا تصور واضح کرنا مقصود ہے۔ مجھے ان کے پاس حاضری دیتے تقریباً دو سال گزر چکے تھے۔ جوانی کا دور تھا ایک دن الارم کے باوجود فجر کی نماز کے وقت آنکھ نہ کھلی اور نماز قضا ادا کی۔ دوسرے روز بھی یہی ہوا، چناں چہ دوسرے روز جب میں گھر سے دفتر جانے کے لیے روانہ ہوا تو خلاف معمول شدید کشش محسوس ہوئی اور میں نے کار کا رُخ کا کا جی ہاؤس کی جانب موڑ دیا۔ کا کا جی صبح نہیں ملتے تھے، کیوں کہ وہ وظائف، ذکر اذکار میں مصروف رہتے تھے۔ وہاں پہنچا تو حیرت ہوئی کہ کا کا جی سڑک پر نظریں لگائے دروازے پر کھڑے تھے۔ چند منٹ اِدھر اُدھر کی گفتگو کرنے کے بعد اشارۃً ''ڈاکٹر صاحب ہر شے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ فوجیں صبح صبح جھنڈے کو سلامی دینے آتی ہیں۔ جب وہ سلامی دے کر چلی جائیں، وقت گزر جائے تو وہاں جانے کا کیا فائدہ؟'' میں سمجھ گیا اشارہ کس طرف ہے۔ اکثر چپ رہا کرتا تھا، لیکن اس روز صبر نہ ہو سکا۔ میں نے پوچھا سرکار آپ کو کیسے علم ہوا کہ دو دن سے میری نماز فجر قضا ہو رہی ہے۔ فرمایا میں تو یونہی بات کر رہا تھا۔ مجھے کیا پتا؟ یہ ایک انداز ہوتا ہے تنبیہ کرنے اور احوال پر نظر رکھنے کا۔ کا کا جی عام طور پر کسی کے گھر نہیں جاتے تھے۔ ایک روز میرے ہاں آئے، میں مؤدب پاس بیٹھا تھا۔ وہ جھکے اور قالین پر اُنگلی سے گول دائرہ بناتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے''۔ اور وہ جگہ وہ تھی، جہاں جائے نماز پر نماز کے دوران سجدہ کرتے ہوئے، اکثر میرا ماتھا زمین پر لگتا تھا۔ یہ ایسی حقیقت تھی، جس کا صرف مجھے ہی علم تھا۔ مقصد آپ پر اپنی پارسائی کی دھاک بٹھانا نہیں۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ مقصد آپ کو یہ بتانا ہے کہ مرشد کامل اپنے مرید کے معاملات سے کس طرف آگاہ رہتا ہے۔ انھی دنوں میرا پنڈی کے ایک بزرگ اور کاروباری شخصیت سے یارانہ ہو گا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ایس لکھتے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ وہ سید ہیں۔ میں کئی روز کا کا جی کے ہاں حاضری نہ دے سکا۔ ایک شام حاضر ہوا تو انھوں نے خفگی کا اظہار بالکل نہیں کیا، کیوں کہ یہ لوگ بے نیاز ہوتے ہیں۔ پہلی دفعہ کھل کر بات کی اور کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ جس کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور اسے سید سمجھتے ہیں وہ دراصل شیخ ہے۔ میں نے تحقیق کی تو ان کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ ایسے تجربات اور واقعات کی ایک قطار ہے، جو میرے ذہن پر دستک دے رہی ہے، لیکن

Marfat.com

میں نے چند ایک سطحی باتیں اس نیت سے لکھی ہیں کہ آپ کو مرشد اور مرشد کامل میں فرق معلوم ہو اور آپ کو اندازہ ہو کہ مرشد کامل، جب کسی مرید پر مہربان ہوتا ہے، تو اس کے احوال، معاملات اور قلبی کیفیات سے آگاہ رہتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اسے تنبیہ بھی کرتا ہے۔ یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ ولی اللہ کے در پر حاجت مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، وہ جسے چاہے قربت سے ہمکنار کر لے اور جسے چاہے دُور ہٹا دے۔ میں اگرچہ تہی دامن ہوں، لیکن ان جیسے بہت سے تجربات سے گزر رہا ہوں، اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ جن حضرات کو یہ تجربہ نہیں ہوا وہ معصوم لوگ اسے سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور ہوسکتا ہے مجھے دو چار پتھر ماردیں یہ الگ بات کہ ایسے پتھروں کی چوٹ تکلیف نہیں، نفرت دیتی ہے۔

Marfat.com

سرگودھا کے قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد میں رہتے تھے۔ شادی کی نہیں تھی۔ کل اثاثہ دو جوڑے کپڑے تھے، جوتی وہ پہنتے نہیں تھے۔ نفس پہ یہ اختیار کہ شدید گرمی میں بھی روزہ افطار کیا تو چند لقمے کھا کر اور پانی کا گلاس پی کر پلیٹ آگے بڑھا دی۔ چند ایک حضرات ان کے پاس موجود رہتے تھے۔ میں جب بھی لاہور سے انھیں ملنے جاتا، تو یہ حضرات کہتے کہ آپ کا انتظار تھا، حالاں کہ وہ دور موبائل فونوں کا دور نہیں تھا۔ ایک روز میں صبح کوئی نو بجے کے قریب حاضر ہوا تو وہ حسب معمول مسجد میں دوزانوں بیٹھے تلاوت فرما رہے تھے۔ حسب معمول حکم ہوا نفل پڑھ لو، پھر کہا کہ سڑک کے اس پار سکول کا چکر لگا آؤ۔ میں سکول میں داخل ہوا تو بچے میدان میں بیٹھے امتحان دے رہے تھے۔ دیکھ کر واپس آ گیا، ان مجالس میں عقیدت کا تقاضا ہوتا ہے کہ آپ بلاچوں چراں حکم کی تعمیل کریں، کھوج لگائیں نہ سوال پوچھیں۔ میں بھی اس واقعے کو بھول گیا۔ دو ماہ کے بعد مجھے پنجاب میں سیکرٹری محکمہ تعلیم لگا دیا گیا۔ وزیر صاحب غدر برپا کرنے کے عادی تھے، چناں چہ ان سے لڑائی ہوگئی اور بعض اصولی اختلافات جنگ میں بدل گئے۔ تین ماہ کے بعد میں نے وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں صاحب سے کہا کہ مجھے اس محکمے سے ٹرانسفر کر دیں، کیوں کہ سیکرٹری وزیر کی لڑائی میں نقصان محکمے کا ہوتا ہے، جو مجھے گوارہ نہیں۔ ٹرانسفر ہوا تو ایک دم یاد آیا کہ میاں جی نے سکول کا چکر لگانے کا حکم دیا تھا۔ بس چکر ہی تو لگانا تھا۔ ایک روز میں میاں جی کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا، تو سامنے صحن سے ایک نوجوان گزرا۔ وہ بی اے کر کے نوکری کی تلاش میں تھا۔ میاں جی نے اسے اندر بلایا اور کہا ''ان سے ملو۔ یہ تمھیں نوکری دلوا دیں گے''۔ میں ان دنوں پنجاب حکومت میں سیکرٹری سوشل ویلفیئر تھا۔ ان کی بات سن کر مجھے خیال آیا کہ حکومت نے بھرتی پر پابندی لگا رکھی ہے۔ میں اسے نوکری کیسے دلواؤں گا؟ اس خیال کا آنا تھا کہ میاں جی نے فوراً اس نوجوان سے کہا کہ جاؤ بھائی۔ اس کی تو اپنی نوکری خطرے میں ہے۔ ابھی ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ وزیراعظم بینظیر بھٹو نے وزیراعلیٰ میاں نواز شریف سے لڑائی کے چکر میں مجھے او ایس ڈی بنا دیا۔ انکوائری کے بعد میرے خلاف اور تو کچھ مل نہ سکا، لیکن مجھ پر وزیراعظم کے خلاف پمفلٹ لکھنے کا الزام لگا دیا گیا۔ لطف کی بات ہے کہ وہ پمفلٹ لکھنا تو کجا، میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ دوسرے دن نوید ملک نے پریس کانفرنس کر کے انکشاف کیا کہ وہ خود اس پمفلٹ کا مصنف ہے اور اس میں اس کے اخبارات میں شائع شدہ مضامین شامل تھے۔ محترمہ اپنی ضد پر قائم رہیں، حتیٰ کہ غلام اسحاق خان نے انھیں فارغ کر دیا۔ محترمہ نے میاں نواز شریف سے انتقام کی لہر میں میری کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر تقرری بھی منسوخ کر دی۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں۔ میاں جی نے جس غریب نوجوان کو نوکری کا عندیہ دیا تھا، میں نے کسی مہربان سے کہہ کر اسے ڈیلی ویجز پر لگوا دیا۔ کئی

Marfat.com

برس کے بعد وہ ملنے آیا تو حیرت ہوئی کہ وہ ریگولر ہو کر ترقی پا چکا تھا، حالاں کہ ڈیلی ویجز والے ریگولر نہیں ہو سکتے۔ ان کے وصال سے چند ماہ قبل 1994ء میں حاضر ہوا تو میاں جی حسب معمول مسجد کی چٹائی پر تشریف فرما تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے دو تین حضرات سے فرمایا ''اس سے ملو۔ یہ محکمہ تعلیم کا بہت بڑا افسر ہے''۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ محترمہ بینظیر بھٹو دوسری بار وزیر اعظم بن چکی تھیں اور میں پھر زیر عتاب تھا۔ 1997ء میں میاں جی کے انتقال کے تین برس بعد میں وفاقی حکومت میں سیکرٹری وزارت تعلیم بنا تو ان کی بات سمجھ میں آئی۔

بے شمار واقعات اور تجربات سے یادوں کا دبستان سجا ہوا ہے، لیکن نہ ہی لکھوں تو بہتر ہے۔ یہ صاحبان نظر کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے۔ مرشد آپ کو اللہ سبحانہ تعالیٰ کی راہ دکھاتا ہے، جب کہ مرشد کامل روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے احوال پہ نگاہ رکھتا ہے، جس کی میں نے فقط چند مثالیں دیں۔ یہی کوئی آٹھ برس قبل میں شادمان لاہور سے گھر آیا تو موبائل پہ ایک صاحب نگاہ کا پیغام ملا ''اس وقت آپ کے گھر میں دو حضرات آئے ہیں۔ ایک صاحب نے سفید رنگ کی قمیض شلوار اور کالی جوتی پہنی ہوئی ہے۔ یہ کون ہیں؟'' میں نے جواب دیا گھر سے پندرہ میل دور ہوں۔ پہنچ کر عرض کروں گا۔ گھر پہنچا تو ملازم نے بتایا کہ دو حضرت ملنے آئے تھے۔ پوچھنے پر اس نے تصدیق کی کہ ایک صاحب نے سفید کپڑے اور کالا جوتا پہنا ہوا تھا۔ جن صاحب کا پیغام آیا تھا وہ لاہور سے دو سو میل دور ایک قصبے میں رہتے تھے، جو حضرات ملنے آئے تھے، وہ میرے رشتے دار تھے اور ان کا اس صاحب نظر سے تعارف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یادوں کا محل پھولوں سے مہک رہا ہے، لیکن میں نے فقط چند ایک کلیاں پیش کیں تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ جب مرشد سے قلبی تعلق قائم ہو جائے تو وہ آپ کے احوال سے آگاہ رہتا ہے اور آپ پر نگاہ رکھتا ہے۔ ناراض نہ ہوں، تو عرض کروں، اگر مرشد صحیح معنوں میں مرشد کامل ہو، تو دنیا سے کوچ کرنے کے بعد بھی روحانی فیض کا سلسلہ جاری رہتا ہے، شرط یہ ہے کہ انسان راہ راست پر رہے۔

Marfat.com

ہجرت نبویؐ کے چند معجزے

کچھ عرصہ قبل یوم حضرت ابوبکر صدیقؓ منایا گیا، تو مجھے ان کا نبی کریمؐ کے ساتھ ہجرت کا مبارک، عظیم، پُرخطر اور تاریخ ساز سفر یاد آتا رہا۔ اسلامی تاریخ اور سیرت کے ان واقعات کو پڑھیں، تو نہ صرف ایمان تازہ ہوتا ہے، بل کہ باطن بھی منور ہوتا ہے اور طبیعت میں خضوع وخشوع کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ مادی زندگی کی مصروفیات اور تگ ودو میں ایسی کیفیت اور روح کی تازگی زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ اسی خیال سے میں نے اپنے قارئین سے کچھ عرصہ قبل وعدہ کیا تھا کہ ان کو اہم کتابوں کے مطالعے میں شامل کرتا رہوں گا، اگر چہ انھوں نے اکثر باتیں سن اور پڑھ رکھی ہوں گی، لیکن پھر بھی ایمان افروز واقعات کو جتنی بار پڑھا جائے، ان کے نئے ''مفہوم'' سمجھ میں آتے ہیں اور غور وغوض کے لیے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

حضور نبی کریمؐ حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر گھر سے باہر تشریف لائے، تو مشرکین خطرناک ارادوں کے ساتھ صفیں بنائے کھڑے تھے۔ آپؐ نے ایک مٹھی سنگریزوں والی مٹی لے کر ان کے سروں پر ڈالی، وہ آپؐ کو دیکھ نہ سکے۔ آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے اور رات ہی رات میں یمن کا رُخ کیا۔ چند میل کا سفر طے کر کے ثور نامی پہاڑ کے ایک غار میں جا پہنچے۔ محاصرین انتظار کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک غیر متعلق شخص آیا اور پوچھا آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں، انھوں نے کہا محمدؐ کا۔ اس نے کہا کہ آپ لوگ ناکام ونامراد ہوئے۔ خدا کی قسم محمدؐ آپ کے پاس سے گزرے اور آپ کے سروں پر مٹی ڈال کر نکل گئے۔ مشرکین نے سروں سے مٹی جھاڑی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

غار کے پاس پہنچے، تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا'' خدا کے لیے ابھی آپؐ داخل نہ ہوں۔ پہلے میں

Marfat.com

داخل ہو کر دیکھتا ہوں کہ اس میں کوئی چیز نہ ہو، چناں چہ حضرت ابوبکرؓ نے غار کو صاف کیا اور اپنا تہ بند پھاڑ کر چند سوراخ بند کر دیے۔ دو سوراخ باقی بچے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دونوں پاؤں ان پر رکھ دیے اور آپؐ سے عرض کی کہ اندر تشریف لائیں۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کی آغوش میں سر رکھ کر سو گئے۔ ادھر ابوبکرؓ کے پاؤں میں کسی چیز نے ڈس لیا، مگر اس ڈر سے حرکت بھی نہیں کہ رسول اللہؐ کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ درد کی شدت سے آنسو نکل آئے، جو رسول اللہؐ کے چہرہ مبارک پر ٹپک پڑے۔ آپؐ کی آنکھ کھل گئی۔ فرمایا۔ ابوبکرؓ کیا ہوا؟ عرض کی میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، مجھے کسی چیز نے ڈس لیا ہے۔ رسول اللہؐ نے اس پر لعاب دہن لگایا تو تکلیف جاتی رہی۔ یہاں دونوں حضرات نے تین راتیں (جمعہ، سنیچر، اتوار) چھپ کر گزاریں۔ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ رات کی تاریکی میں آ کر مل جاتے اور حضرت ابوبکر کے غلام عامرؓ بن فہیرہ بکریاں چراتے رات کی تاریکی میں غار کے پاس آتے اور اس طرح دونوں حضرت رات کو آسودہ ہو کر دودھ پی لیتے۔ کھوجیوں کی مدد سے مشرکین آپؐ کو تلاش کرتے غار کے دہانے پر بھی پہنچے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ صحیح بخاری کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے سر اُٹھایا تو ان کو لوگوں کے پاؤں نظر آئے۔ فرمایا ''اے اللہ کے نبیؐ اگر اُن میں کوئی شخص اپنی نگاہ نیچی کر دے، تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آپؐ نے فرمایا ابوبکرؓ خاموش رہو۔ ہم دو ہیں جن کا تیسرا اللہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک معجزہ تھا۔ تلاش کرنے والے واپس چلے۔ دوشنبہ کی رات آئی، جو ربیع الاول ۱ ہجری کی چاند رات تھی۔ دونوں مقدس ہستیوں نے اونٹنی پر مدینہ کے لیے سفر کا آغاز کیا۔ آپ کس راہ اور کن راستوں سے ہوتے ہوئے گزرے، یہ تفصیلات کتابوں میں موجود ہیں اور کچھ عاشقان رسول آپؐ کی اتباع میں ہجرت کے راستے پر سفر بھی کر چکے ہیں۔ ہجرت کی راہ کے بہت سے واقعات میں سے چند ایک پیش خدمت ہیں۔ صحیح بخاری کے مطابق حضرت ابوبکرؓ مروی ہیں کہ ہم لوگ غار سے نکل کر رات بھر اور دن میں دوپہر تک چلتے رہے۔ ایک لمبی چٹان دکھائی دی جس کے سایے پر دُھوپ نہیں آئی تھی۔ وہیں اُتر پڑے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے نبیؐ کے سونے کے لیے جگہ بنائی اور اس پر پوستین بچھا کر گزارش کی آپؐ سو جائیں۔ اچانک ایک چرواہا بکریاں لیے چٹان کی جانب آیا، کیوں کہ وہ بھی سایے کی تلاش میں تھا۔ میں نے کہا تمھاری بکریوں میں کچھ دودھ ہے۔ کیا میں دودھ لے سکتا ہوں۔ اس نے کہا ''ہاں''، پھر اس نے ایک بکری پکڑی، اس کے تھن کو مٹی بال تنکے وغیرہ سے صاف کیا اور پھر اس نے ایک کاب میں تھوڑا سا دودھ دوہ کر دیا۔ میرے پاس ایک چرمی لوٹا تھا، جو میں نے آپؐ کے لیے پینے کے اور وضو

Marfat.com

کے لیے رکھ لیا تھا۔ آپؐ بیدار ہوئے، تو میں نے دودھ پر پانی انڈیلا یہاں تک کہ اس کا نچلا حصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے بعد کہا اے اللہ کے رسولؐ پی لیجیے۔ آپ نے پیا یہاں تک کہ میں خوش ہو گیا۔ اس کے بعد ہم چل پڑے۔

اس سفر میں آپؐ کا گزر اُم معبد خزاعیہ کے خیمے سے ہوا۔ وہ اپنے خیمے کے صحن میں بیٹھی رہتیں اور آنے جانے والوں کو کھلاتی پلاتی رہتیں۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تمھارے پاس کھانے کو کچھ ہے۔ بولیں بہ خدا ہمارے پاس کچھ ہوتا تو آپ لوگوں کی میزبانی میں تنگی نہ کرتیں۔ یہ قحط کا زمانہ تھا۔ رسول اللہؐ نے دیکھا کہ خیمے کے ایک گوشے میں ایک بکری کھڑی ہے۔ فرمایا اُم معبد! یہ کیسی بکری ہے۔ بولیں اسے کمزوری نے ریوڑ سے پیچھے چھوڑ رکھا ہے۔ آپؐ نے دریافت کیا اجازت ہے اسے دوہ لوں۔ اجازت ملنے پر آپؐ نے بکری کے تھن پر ہاتھ پھیرا۔ اللہ کا نام لیا اور دُعا کی۔ بکری نے پاؤں پھیلا دیے۔ آپؐ نے ایک بڑا سا برتن لیا۔ اس میں دودھ دوہنے لگے یہاں تک کہ برتن بھر گیا اور جھاگ اُوپر آ گیا۔ اُم معبدؓ کو پلایا، پھر خود پیا اور اپنے ساتھی کو پلایا، پھر اسی برتن میں دوبارہ دودھ دوہنے لگے، برتن پھر سے بھر گیا، اسے اُم معبد کے پاس چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئے۔ حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ رسولؐ نے کدھر کا رُخ فرمایا ہے کہ ایک جن زیریں مکہ سے یہ اشعار پڑھتا ہوا آیا۔ لوگ آواز سن رہے تھے، لیکن اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جب میں نے اس کی بات سنی تو ہمیں معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ نے مدینہ کی جانب رُخ کیا ہے۔ راستے میں سُراقہ بن مالک نے غلط ارادے سے آپ کا تعاقب کیا۔ وہ گھوڑے پر سوار نیزہ لیے اس کارواں کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا پھسلا اور وہ گر گیا، پھر سوار ہوا اور گھوڑا دوڑنے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہے تھے، اس کا کہنا ہے کہ اچانک میرے گھوڑے کے دونوں پاؤں زمین میں دھنس گئے اور میں گر گیا۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ رسول اللہ کا معاملہ غالب ہو کر رہے گا۔ حتیٰ کہ دوشنبہ آٹھ ربیع الاول 1 ہجری مطابق 23 ستمبر 622ء کو رسول اللہؐ نے قبا میں قدم رنجا فرمایا۔ یہاں آپؐ نے چار دن قیام فرمایا اور حکم الٰہی کے مطابق جمعہ کے دن مدینہ تشریف لے گئے۔ اسی دن سے اس شہر کا نام یثرب کے بجائے مدینۃ الرسول پڑ گیا۔ گلی کوچوں میں آپ کا جس طرح والہانہ اور تقدیس وتحمید کے کلمات کے ساتھ استقبال ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ (مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی کتاب الرحیق المختوم سے ماخوذ) میں جب ہجرت کے عظیم الشان، مقدس، تاریخ ساز اور نہایت پُرخطر سفر کی داستان پڑھ رہا تھا، تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ تاریخی سفر معجزوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پہ معجزوں کا ظہور ایسا روحانی

Marfat.com

سرچشمہ ہے، جس کے فیض کے چشمے قیامت تک بہتے رہیں گے۔ حضور نبی کریمؐ کے اسی روحانی ورثے سے روحانیت کے چشمے جاری وساری رہے، جن سے غلامان رسولؐ، عاشقان رسولؐ اور عاشقان الٰہی اپنی اپنی بساط اور مقدر کے مطابق مستفید اور فیضیاب ہو کر نہ صرف اپنے باطن روشن کرتے رہے، بل کہ روحانیت کے فیض کو بھی جاری رکھا۔ اولیاے کرام روحانیت کے اسی ورثے کے امین تھے اور امین ہیں، تو پھر ان کی کرامات سے انکار کیوں؟ روحانیت رسول اللہؐ کی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس لیے دنیا کبھی بھی روحانیت سے خالی نہیں ہوگا اللہ سبحانہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی اس توفیق اور نبی کریمؐ کی نگاہ کے صدقے حاصل ہونے والی روشنی کے ان مظاہر کے حوالے سے شک کیوں؟

Marfat.com

مٹی

کچھ کالم نگار صرف سیاست کو تختۂ مشق بناتے ہیں، کچھ اُدبی رنگ میں لکھتے ہیں، کچھ سماجی، سائنسی اور تعلیمی موضوعات پر لکھتے ہیں اور کچھ مزاح سے قارئین کا دل بہلاتے ہیں۔ یہ سب حضرات ''صاحب طرز'' کالم نگار ہیں اور ان کے اپنے اپنے مخصوص موضوعات اور ''میدان'' ہیں۔ میں ''بے طرز'' لکھاری ہوں، کیوں کہ میں کبھی سیاست پر، کبھی قائداعظم اور تاریخی موضوعات پر، کبھی تعلیمی، سماجی اور قومی کردار پر، کبھی سیرت پر اور کبھی کبھی متفرق قسم کے کالم لکھتا ہوں، جنھیں لوگ روحانی تحریریں کہتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے کچھ علم نہیں روحانیت کیا ہوتی ہے، کیوں کہ میں نے نہ روحانیت کو موضوع کی حیثیت سے پڑھا ہے اور نہ ہی مجھے اس کے پس منظر یا ''ابجد'' کا پتا ہے۔ روح تو ہر جان دار اور ہر انسان کے اندر ہوتی ہے اور روح ہی زندگی کی علامت ہے، کیوں کہ جب روح داغ مفارقت دے جائے، تو انسان محض مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے، جسے مٹی میں دفن کر کے مٹی بنا دیا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض فقرا اور صوفی شاعر انسان کو چلتی پھرتی مٹی کہتے ہیں۔ سبحان اللہ بابا فرید نے اس بات کو نہایت خوب صورت اور دل پذیر انداز سے بیان کیا ہے۔ یہ روحانی کلام ہے، کیوں کہ یہ زندگی کی اَبدی حقیقت، نظر کے دھوکے، زندگی کے مغالطے اور انسان کے اپنے اردگرد بُنے ہوئے فریب کے جال کو تار تار کرتا ہے اور اُسے اپنی ''اصل'' کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ بابا جی فرماتے ہیں:

دیکھ فریدا مٹی کُھلی ...... مٹی اُتے مٹی ڈُلی
مٹی ہسے، مٹی روئے ...... اَنت مٹی دا مٹی ہوئے

Marfat.com

نہ کر بندیا میری میری...... نہ تیری، نہ میری

چار دِناں دا میلہ دُنیا...... فیر مٹی دی ڈھیری

نہ کر اتھے ہیرا پھیری...... مٹی نال نہ دھوکہ کرتوں۔ توں وی مٹی، اووی مٹی

ذات پات دی گل نہ کر تو...... ذات وی مٹی، توں وی مٹی

ذات صرف خدا دی اُوچی...... باقی سب کچھ مٹی، مٹی

معاف کیجیے گا میں خود کو بابا فرید کے کلام کے ترجمے کا اہل نہیں سمجھتا اور ترجمے میں وہ لطف، گہرائی اور دل کو چھونے والی کیفیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ آپ غور سے پڑھیں، دوبار پڑھیں تو فہم کے دروازے کھل جائیں گے، زندگی کی بے ثباتی، ہماری نگاہوں کا فریب زندگی اور دنیا کی اصل حقیقت کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ گویا صوفیانہ کلام روح سے مخاطب ہوتا ہے، اس کا پیغام یا تاثیر آنکھوں سے اتر کر ذہن میں منتقل نہیں ہوتی، بل کہ روح کی جانب سفر کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ ہر وہ چیز، لفظ اور تحریر جو ذہن کے بجائے رُوح کو متاثر کرے، رُوحانی کہلاتی ہے۔ یاد رکھیے ذہن اور رُوح مختلف شعبے، مختلف چیزیں اور مختلف سلطنتیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح قلب کی اپنی دنیا ہے، لیکن روح کا راستہ قلب سے گزرتا ہے، کیوں کہ روح قلب کے عین وسط میں پوشیدہ وہ نورِ الٰہی ہے، جو امراضِ قلب کے ماہرین کو آپریشن کے دوران بھی نظر نہیں آتا، لیکن زندگی کا سارا دارومدار اسی رُوح پر ہوتا ہے۔ رُوح امرِ الٰہی ہے، روزِ اول سے موجود ہے اور اَبد تک موجود رہے گی، جب کہ مٹی کا بنا ہوا جسم فانی ہے۔ ایک مخصوص عرصے اور مخصوص مدت کے لیے مرض وجود میں آتا ہے اور پھر مٹی کی ڈھیری بن جاتا ہے، چوں کہ رُوح قلب کے وسط میں پوشیدہ امرِ الٰہی ہے، اس لیے جو چیز، لفظ، خیال، بات یا تحریر روح کو چھوتی ہے، وہ بہ ہر حال قلب کو بھی متاثر کرتی ہے اور جو شے قلب کو متاثر کرتی ہے، وہ پھر ذہن پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، البتہ ذہن کو متاثر کرنیوالی ہر شے، قلب یا رُوح کو متاثر نہیں کرتی، لیکن رُوح و قلب کو چھونے والی ہر شے بہ ہر حال ذہن پر اپنا نقش بناتی اور سوچ کی تاروں کو چھیڑتی ہے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں ہرگز صاحب طرز ادیب یا کالم نگار نہیں، کیوں کہ میرے موضوعات مخصوص نہیں اور نہ ہی میں کسی صنف یا میدان کا شہسوار، اسپیشلسٹ یا ماہر فنکار ہوں۔ زندگی مختلف مراحل اور گوناں گوں تجربات سے گزرنے کا نام ہے، جن کے دوران بے شمار مشاہدات، حادثات اور تجربات کا مزا چکھنا پڑتا ہے۔ انھی حادثات میں کچھ وارداتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو آپ کی روح کو

Marfat.com

متاثر کرتی اور اپنا ابدی نقش یا تاثر چھوڑ جاتی ہیں۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ کلام الٰہی، عشق رسول، اولیا کرام اور صاحبان نگاہ کی نگاہ کے علاوہ رُوح کو کچھ بھی متاثر نہیں کرتا۔ ظلم وستم اور بے انصافی کے واقعات ہمیں جھنجھوڑتے ضرور ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری روح کو متاثر کر رہے ہیں، حالاں کہ وہ صرف ذہن اور قلب کو متاثر کرتے ہیں۔ روح کو صرف ذکر الٰہی، حب رسول اور روحانی شخصیت کی نگاہ ہی متاثر کرتی ہے، جو روح سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور روح کی گہرائی تک پہنچتی اور اُترتی ہے۔ دراصل یہ روحوں کا سنگم اور رُوحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ اسی لیے فقیر کی نگاہ، روح میں وہ لہریں متحرک کر دیتی ہے، جو سارے جسم، یعنی جسم کے ہر حصے پر چھا جاتی ہیں۔ نگاہ بڑی وسیع شے ہے۔ اس میں دیکھنا، بات کرنا، اشارے سے پیغام دینا، گہری توجہ دینا اور رمز وکنایہ سب کچھ شامل ہے، لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے کہ نگاہ کب، کس وقت اور کیوں پڑتی ہے، یہ ہر ایک کا مقدر نہیں ہوتی۔ جن کے باطن دنیاوی ہوس اور کبیرہ گناہوں سے آلودہ ہوں، اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہوں اور منوں کوڑے تلے دبے ہوں، انھیں اس طرح کی نگاہ میسر نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ نگاہ اُس برسات کے مانند ہوتی ہے، جو زرخیز زمین میں سرسبز وشاداب فصلیں اور پھول اُگا دیتی ہے، اگر زمین تیار نہ ہو، زرخیز نہ ہو، اس میں بیج موجود نہ ہو، تو بارش نہ اپنا رنگ دکھا سکتی ہے اور نہ ہی بنجر زمین کو ہریالی عطا کر سکتی ہے۔ اس طرح کی صورت میں فقیر، صوفی یا ولی وہ نگاہ نہیں ڈالتا، جو روح تک اُترتی اور روشنیوں کو دوبالا کرتی ہے۔ یقین رکھیے صاحب نظر یا صاحب نگاہ ایک ہی نظر میں ہمیں پہچان جاتا ہے، وہ زبان سے اظہار نہیں کرتا، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ پردہ پوشی کا حکم دیتے ہیں، چناں چہ وہ اس رُوح کی روشنی کو دوبالا نہیں کرتا، جو اعمال کے کوڑے تلے دبی ہوئی ہو۔

معاف کیجیے گا۔ بات ذرا دُور نکل گئی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ یارو میں کوئی صاحب طرز لکھاری نہیں۔ میرا جس موضوع پر دل چاہتا ہے، لکھنا شروع کر دیتا ہوں اور کبھی کبھی آپ کو زندگی کے تجربات و مشاہدات میں بھی حصہ دار بنا لیتا ہوں۔ جب کوئی مخصوص موضوع ذہن میں نہ ہو تو قلم قلبی وارداتوں کی وادی میں چلنا شروع کر دیتا ہے اور انٹ شنٹ لکھنا شروع کر دیتا ہے، جسے کچھ قارئین روحانی تحریروں کے چوکھٹے اور فریم میں فٹ کر لیتے ہیں، حالاں کہ مجھے بالکل علم نہیں کہ روحانی تحریریں کیا ہوتی ہیں اور روحانیت کیا شے ہے؟ ایسا شاید ان قلبی وارداتوں یا نگاہوں کا عطیہ ہے، جو کبھی کبھار قلب سے گزر کر روح کو متاثر کرتی رہیں۔ ’’کچھ قارئین‘‘ میں نے اس لیے لکھا کہ بعض حضرات کو ایسی تحریریں پڑھ کر غصہ آتا ہے اور بعض انھیں پسند کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ایک محفل میں کسی صاحب نے ناپسندیدگی کا اظہار

Marfat.com

کرتے ہوئے تکبر سے کہا ''تم ہرگز صوفی نہیں ہو، پھر صوفی کیوں بنتے ہو'' میں نے عرض کیا حضور میں تو صوفی کے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ میں تو ایک دنیادار گناہ گار انسان ہوں۔ ایسی تحریریں لکھنے سے انسان صوفی نہیں بن جاتا۔ یہ تو محض میلان طبع یا افتادِ طبع کا کرشمہ ہوتا ہے۔ موجد کبھی ایجاد نہیں بن سکتا، مصور خود تصویر نہیں ہوتا، ادیب اپنی ذات میں اَدب نہیں ہوتا، کھلاڑی کھیل نہیں ہوتا اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ صوفیانہ قسم کی تحریریں لکھنے والا خود بھی صوفی ہو، اگر کسی کے الفاظ قاری کے دل کی تاروں کو چھیڑ جائیں اور روح کو چھو جائیں تو یہی اس کا حاصل ہوتا ہے، جس کا اُجر صرف میرے رَبّ کے ہاں ہے اور اُجر کی تمنا بھی صرف رَبّ سے ہی کرنی چاہیے۔ ''اس سے آپ کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟'' یہ سوال میرے ذہن میں لپکا، لیکن زبان پہ نہ آسکا۔ الحمدللہ۔ اَللہ کا شکر ہے کہ میں اس مرتبہ، دل آزاری کا مرتکب نہ ہوا، جس کا میں ہر وقت ارتکاب کرتا رہتا ہوں اور اَللہ سے معافی مانگتا رہتا ہوں۔ صوفی بہت ہی بلند مقام ہے، کیوں کہ صوفی ایسا پھل دار درخت ہوتا ہے، جس پر لوگ پتھر پھینکتے ہیں، تو وہ جواباً پھل دیتا ہے۔ ہم میں اتنا صبر، حوصلہ، ظرف اور برداشت کہاں؟ یہ اتنی ہی آسان منزل ہوتی تو حضرت علیؓ صبر کو سب سے بڑی بہادری قرار نہ دیتے۔ یہ میرے رَبّ کی دین ہے، ہر کسی کا نصیب کہاں!!

Marfat.com

اِس رَنگ بَرنگی دُنیا میں......

دراصل کائنات کے سارے حسن کا راز تنوع، رنگارنگی، تبدیلی اور تغیر میں ہے۔ آپ سوچیں، اگر کائنات کی ہر شے ایک جیسی ہوتی، تو اس یکسانیت سے کتنی بوریت اور بیزاری جنم لیتی، اگر ساری زمین، انسان، حیوان، پھول، درخت، حتیٰ کہ انسانی چہرے بھی ایک جیسے ہوتے تو کائنات اپنی کشش اور حسن کھو بیٹھتی۔ گویا زندگی کا تغیر اور رنگارنگی ہی فطرت کا قانون اور رضائے الٰہی ہے اور رضائے الٰہی سے برتر کوئی شے نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ خالق سے بڑھ کر کون اپنی مخلوق کو جان اور سمجھ سکتا ہے۔ بات دُور نکل جائے۔ میں فقط اس تغیر کے ایک چھوٹے سے نقطے پر فوکس کرنا چاہتا ہوں، ورنہ تو یہ موضوع کتابوں کا ہے، کالموں کا نہیں۔ اس تمہید کا مقصد یہ کہنا ہے کہ انسان ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ انسان زندگی کے ارتقائی سفر میں عروج وزوال کی گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے بدلتا رہتا ہے۔ سچ، مگر یہ ہے کہ صرف اس کی ظاہری شخصیت، یعنی قد کاٹھ، جسم اور چہرے کے نقوش ہی نہیں بدلتے، بل کہ اس کا باطن اور اندرونی کیفیت اور ہاں سوچ، نظریات اور فکر بھی بدلتی رہتی ہے۔ چہروں کا تو یہ حال ہے، اگر کوئی آپ سے اچانک چالیس پینتالیس برس بعد ملے تو اسے پہچاننے میں ذرا سی دقت محسوس ہوتی ہے۔ کچھ لوگ عمر چور بھی ہوتے ہیں، مگر بہت کم ورنہ اکثریت کا یہی حال ہے۔ میں عرض کررہا تھا کہ ظاہری شباہت کے علاوہ انسان اندر سے بدلتا رہتا ہے اور اکثر یہ اندرونی کیفیت ظاہر کو بھی متاثر کرتی ہے۔ ظاہر پہ ہی موقوف نہیں، انسانوں کے کردار بھی بدلتے رہتے ہیں۔ میرے کتنے ہی شناسا کلین شیو تھے، دیکھتے ہی دیکھتے حضرت ''مولانا'' ہوگئے۔ کسی نے چھوٹی، کسی نے بڑی ریش مبارک بڑھالی۔ یہ تبدیلی ہمیشہ تو نہیں، لیکن اکثر اوقات باطنی تبدیلی کی عکاس ہوتی ہے۔ میرے دوستوں میں کئی حضرات ایسے بھی ہیں، جو صرف

Marfat.com

انگریزی لباس پہنتے تھے، لیکن اب صرف پاکستانی لباس پہنتے ہیں۔ میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے جوانی کی حدود میں داخل ہونے سے قبل بعض حضرات کو ''مسیتل'' پایا۔ پنجابی میں میسیت، کا مطلب مسجد ہوتا ہے اور مسیتل اسے کہتے ہیں، جو پانچوں وقت مسجد کی جانب دوڑتا ہو، پھر میں نے انھیں مسجد سے دُوری کا شکار ہوتے بھی دیکھا۔ بعض حضرات تو مسجد کا راستہ تک بھول گئے اور بعض ایسی کمپنی میں جا پھنسے کہ لہو ولعب سے ہوتے ہوئے مے خانوں کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنے لگے۔ بعض کسی لیلیٰ کی زلف کے اُسیر ہوئے اور سب کچھ بھلا بیٹھے۔ زندگی کے اس ارتقائی سفر میں کچھ شناسا ایسے بھی ملے، جو مے خانوں اور حسینوں اور لہو ولعب سے تائب ہو کر اللہ کے گھر میں پناہ گزین ہو گئے اور پھر زندگی بھر نالہ نیم بشی کے ساتھ مغفرت مانگتے رہے۔ میرے مشاہدے کے مطابق میں نے عام طور پر ایسے نوجوانوں کو مذہب سے باغی ہوتے دیکھا، جو والدین اور ماحول کے جبر کے تحت نمازی بن گئے تھے اور جب اس جبر کے ماحول سے آزاد ہوئے، یعنی کالج پہنچے تو آزاد خیال ہو گئے اور ولایت گئے تو اپنے آپ سے آزاد ہو گئے۔ میرے کلاس فلوز میں ایک ایسا نوجوان بھی تھا، جو پہلے دن کلاس میں آیا تو ماشاء اللہ اس کی ریش مبارک ان کی ناف تک آتی تھی۔ کھلا پاجامہ، کُرتا اور کالی ٹوپی پہن کر جب وہ کلاس میں پہلے دو تین ماہ آتا رہا، تو یوں لگتا جیسے کوئی شے چڑیا گھر سے بھاگ کر آئی ہے۔ اس دور میں کالج میں صرف پتلون، قمیض اور سردیوں میں پتلون پر کوٹ اور ٹائی لگائی جاتی تھی، حتیٰ کہ کالج کے نائب قاصد بھی پتلون پہنتے تھے۔ یہ صاحب پنجاب کے کسی دور دراز علاقے سے آئے تھے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ان کی ریش مبارک کا قد گھٹنا شروع ہوا، پھر پاجامہ کُرتا کی جگہ پتلون قمیض نے لی، پھر ٹوپی اُتری اور کوئی ایک سال کے اندر اندر داڑھی محض فیشن بن کر رہ گئی۔ پہلے نمازوں سے غفلت، پھر ترک نماز اور پھر دانش وروں کی محفلوں میں شریک ہو کر تھوڑی تھوڑی پینے لگے۔ خود بھی ادیب، دانش ور اور لکھاری تھے اور اس دور میں افواہ، یعنی عام تاثر یہ تھا کہ لکھاری اور دانشور بننے کے لیے انگور کی بیٹی سے تعلقات استوار کرنے ضروری ہیں، چناں چہ وہ لاہوری دانش وری کے تقاضے پورے کرتے کرتے شاعرانہ تخیل کی آبیاری آب حرام سے کرنے لگے۔ ایک روز راز و نیاز کے موڈ میں بتایا کہ ایک کلاس فیلو سے محبت کی پینگیں چڑھا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اُسے آپ کی داڑھی پہ تو اعتراض نہیں، انھوں نے نہایت بھولپن سے جواب دیا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں، کیوں کہ اس کے والد صاحب بھی باریش ہیں۔ یہ سن کر میری ایسی ہنسی چھوٹی کہ قابو پانا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک لکھ چکا ہوں، تو مجھے اپنا ایک ہوسٹل فیلو یاد آ رہا ہے، جو کالج میں مجھ سے ایک سال جونیئر

Marfat.com

تھا۔ کسی رئیس خاندان کا یہ چشم و چراغ نہایت نفیس الطبع نوجوان تھا۔ مزاج کے اعتبار سے نہایت شریف، مذہبی اور کم گو واقع ہوا تھا۔ ہوسٹل میں ذاتی ملازم کا تصور نہیں ہوتا، لیکن اس کے والد صاحب نے اس کے ساتھ ایک ذاتی گھریلو قسم کا خدمت گار بھی ''تعینات'' کر رکھا تھا۔ ایک روز میں اس کے کمرے میں گیا، تو وہ نہایت غمزدہ شکل بنائے اپنے ذاتی ملازم سے کہہ رہا تھا کہ تم داتا دربار جاؤ اور میرے لیے دُعا کرو کہ مجھے شمیم سے محبت نہ ہو۔ شمیم فرضی نام ہے، کیوں کہ اس نے اپنی جس کلاس فیلو کا نام لیا تھا، اگر میں اس کا نام لکھ دوں تو اس خاتون کے صاحبزادگان مجھے قتل کرنے تشریف لے آئیں گے۔ خود بھی آنے کی ضرورت نہیں، آج کل تو قتل کرانا آسان ترین کام ہے۔ میں اسے اس غم میں مبتلا پا کر پہلے تو پریشان ہوا، پھر مسکرا دیا۔ اس نے مجھے کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا، تم مسکرا کیوں رہے ہو؟ میرا جواب تھا۔ دوست اب دیر ہو چکی۔ اب داتا صاحب دُعا منگوانے کا فائدہ نہیں ہوگا۔ تم کہہ رہے ہو کہ جاؤ دعا کرو مجھے اس سے محبت نہ ہو۔ دراصل تم محبت کے تیر سے گھائل ہو چکے ہو۔ اب دُعائیں اور دوائیں کام نہیں کریں گی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، پھر اس نے نمازیں اور سجدے طویل کر دیے۔ اللہ پاک نے اسے محفوظ رکھا، ورنہ میں نے لوگوں کو اس راہ میں پھسلتے اور پھر اُداسی مٹانے کے لیے مختلف مشاغل میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ایک عرصہ، بل کہ طویل عرصہ گزر گیا۔ کئی برس پہلے میں اسلام آباد کلب سے چائے پی کر نکل رہا تھا، تو وہ دوست اچانک مل گیا۔ وہ ولایت سے ڈگریوں کے ساتھ پلٹ کر بڑا ڈاکٹر بن چکا تھا اور ایک بڑے ہسپتال میں خدمت خلق میں مصروف تھا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ انسان ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ ارتقا، تغیر اور رنگارنگی قدرت کا اصول اور فطرت کا حسن ہے۔ بقول علامہ اقبال زندگی کے سفر میں انسان کی شخصیت کئی بار مرتی اور اُس سے نئی شخصیت جنم لیتی ہے، چناں چہ علامہ فرماتے ہیں کہ زندگی اموات کا ایک سلسلہ ہے۔ یہاں موت سے مراد انسان کا تغیر، ارتقا اور تبدیلی ہے۔ خود علامہ اقبال اور قائداعظم بھی 40,35 برس عمر گزارنے کے بعد ذہنی، نظریاتی، حتیٰ کہ جسمانی حوالے سے بھی وہ نہیں رہے تھے، جو وہ زمانہ طالب علمی یا اوائل جوانی میں تھے، البتہ میں نے زندگی کے سفر میں ان لوگوں کو خاص حد تک ثابت قدم اور مستقل مزاج پایا، جن کی تربیت والدین اور اساتذہ نے ٹھوس بنیادوں پر کی تھی اور جن کی شخصیت میں شروع ہی سے توازن اور میانہ روی تھی۔ ان کے ذہنوں میں اخلاقی اور مذہبی قدریں اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھیں کہ اول تو وہ انھیں پھسلنے نہیں دیتی تھیں، اگر کبھی پھسلے بھی تو جلد سنبھل جاتے تھے۔ درمیانے طبقات کے ایسے

Marfat.com

نوجوان اکثر ثابت قدم رہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اولادِ آدم کا کوئی بھروسا نہیں اور نہ ہی اس حوالے سے کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ آپ محض اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اندازہ غلط بھی نکل سکتا ہے اور درست بھی۔ مطلب یہ کہ کائنات اور زندگی کا حسن ہی تغیر، تبدیلی اور رنگا رنگی میں ہے۔ انسان ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا اور انسانی رویے، سوچ و فکر، انداز، اطوار حالات اور حقائق کی زد میں آ کر بدلتے رہتے ہیں، البتہ وہ لوگ عظیم کہلانے کا حق رکھتے ہیں، جو مضبوط اور مستحکم کردار کے مالک ہوتے ہیں اور زندگی کے تغیرات اور حقائق سے کردار کو متاثر نہیں ہونے دیتے، ورنہ تو شیطان ہر وقت گھات لگائے منتظر رہتا ہے۔ یہ گانا آپ نے بھی سنا ہوگا۔

اس رنگ برنگی دنیا میں انسان بدلتے رہتے ہیں
گھر ایک ہی رہتا ہے، لیکن مہمان بدلتے رہتے ہیں

Marfat.com

عزت اور شہرت؟

دوستو عزت اور شہرت میں زمین آسمان کا فرق حائل ہے اور شہرت وہی اچھی اور خوش نصیبی کی علامت سمجھی جاتی ہے، جس کے سوتے عزت سے پھوٹیں، پھر عزت کمانے کے لیے مشہور یا شہرت یافتہ ہونا بھی ضروری نہیں، کیوں کہ شہرت اور عزت مقدر کے دو الگ الگ خانے ہیں۔ مشہور اور شہرت یافتہ تو استاد امام دین بھی ہیں، لیکن عزت علامہ اقبال جیسے شعرا کے حصے میں آئی۔ یہی وہ عزت ہے، جو مستقل شہرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہر شہرت یافتہ شخص با عزت نہیں ہوتا اور ہر با عزت شخص شہرت یافتہ نہیں ہوتا، اس لیے مجھے ان دوستوں پر حیرت ہوتی ہے، جو اس لیے شہرت کے پیچھے بھاگتے ہیں کہ اس سے عزت ملتی ہے۔ میں شاید اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت نہ سمجھتا، لیکن چند روز قبل میں نے ایک دوست کو مغموم پایا۔ وجہ پوچھی تو راز کھلا کہ وہ خود کو شہرت یافتہ بھی سمجھتے ہیں اور با عزت بھی، لیکن انھیں غم اس بات کا ہے کہ وہ سرکاری تقریبات اور حکمرانوں کی محفلوں میں بلائے نہیں جاتے۔ مجھے بہ ہر حال ان حضرات سے ہمدردی ہوتی ہے، جو سرکاری تقریبات میں بلائے نہ جانے پر مغموم ہو جاتے ہیں، حالاں کہ اس سے نہ صرف ان کی شہرت کو کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ ہی ان کی عزت متاثر ہوتی ہے۔

شاید زندگی کے فلسفے، بے ثباتی اور انجام پر نظر رکھی جائے، تو انسان ایسے سطحی جذبوں اور وقتی غموں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ ہر دور اور ہر معاشرے میں سیکڑوں، بل کہ ہزاروں لوگ کسی نہ کسی وجہ سے شہرت یافتہ بھی رہے ہیں اور عزت یافتہ بھی، لیکن آج بے رحم وقت کے ہاتھوں ان کا نام و نشان، یعنی نام اور نشان دونوں مٹ چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ آج ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ تاریخ اور زندگی میں صرف وہ لوگ زندہ رہے اور با عزت ٹھہرے، جن کے کارنامے اس قابل تھے کہ انسانی حافظہ اور تاریخ

Marfat.com

انھیں یاد رکھتی۔ گویا انسان شہرت اور عزت اپنے کام اور کارنامے سے کماتا ہے اور جو کارنامے کسی بھی حوالے سے صدقہ جاریہ ہوں، وہ جاری و ساری رہتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایسے کارناموں میں سیاسی، سائنسی، معاشرتی، خدمتی، ادبی وغیرہ وغیرہ ہر قسم کے کارنامے شامل ہیں، لیکن ان سب کی بنیاد جذبہ خدمت پر ہوتی ہے اور خدمت ہی کے سبب کوئی کارنامہ صدقہ جاریہ بنتا ہے اور مستقل جگہ پاتا ہے۔ کارنامے بڑے اور چھوٹے ہو سکتے ہیں، ان کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے، لیکن بنیاد خدمت اور پائیداری ہونی چاہیے۔ ہوسکتا ہے آپ میرا مفہوم نہ سمجھے ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کارناموں کی اقسام پر حیرت کا شکار ہوں، اس لیے وضاحت لازم ہے۔ سیاسی کارناموں کے حوالے سے، اگر قائداعظم اور علامہ اقبال تاریخ کا زندہ حصہ ہیں، تو تعلیمی اور معاشرتی حوالے سے سرسید اور علی گڑھ تاریخ کے زندہ کردار ہیں۔ شاعری کے حوالے سے، اگر غالب و اقبال کا نام زندہ ہے اور باعزت ہے، تو اَدبی حوالے سے پطرس، مشتاق یوسفی مزاحیہ ادب کے صدقہ جاریہ ہیں، افسانے کی سلطنت اور صوفیانہ اظہار کے حوالے سے، اگر اشفاق احمد ایک زندہ استعارہ بن چکے ہیں، تو احمد ندیم قاسمی اور فیض بھی اَدب کی سلطنت کے تخت نشینوں میں شامل ہیں۔ سائنسی خدمات کے حوالے سے، اگر ڈاکٹر عبدالقدیر خان زندہ نام ہیں، تو انسانی خدمت کے حوالے سے ایدھی تاریخ میں جگہ پا چکے ہیں۔ بات کو اختصار کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ہر دور میں، ہر زمانے میں لوگ مشہور بھی ہوتے ہیں، لیکن یہ شہرت انتہائی وقتی ہوتی ہے، جسے پبلسٹی کے ہتھکنڈے استعمال کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ اپنی اپنی قدر و قیمت کے حساب سے ایسے شہرت یافتہ کرداروں کو تھوڑی بہت عزت بھی ملتی ہے، لیکن یہ شہرت اور عزت ہوا کے جھونکے کے مانند ہوتی ہے، بس تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈک، راحت اور آسودگی دے کر غائب ہو جاتی ہے۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد تو نام و نشان دونوں مٹ جاتے ہیں۔ عقل مند اور دنیاداری کے ماہرین اس وقتی شہرت سے خوب فائدے اُٹھاتے اور حسرتیں آرزوئیں پوری کرتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ وقت کے بہاؤ میں بہہ کر زندگی کے سمندر میں گم ہو جاتا ہے۔ زندہ شہرت اور اُبھری عزت صدقہ جاری ہوتی ہیں اور اس کی بنیاد بھی ایسے کارناموں پر ہوتی ہے، جو مستقل نوعیت رکھتے ہوں اور جن سے اولادِ آدم یا قوم کسی نہ کسی حوالے سے فیض یاب ہوتی ہو۔ جتنا بڑا کارنامہ ہوگا، جتنا وسیع اس کا فیض ہوگا، اسی قدر وسیع عزت و شہرت ہوتی ہے اور اسی قدر اس کی پائیداری ہوتی ہے۔

یہ بھی ایک قابل غور پہلو ہے کہ کیا شہرت ہمیشہ عزت لاتی ہے؟ شہرت اور عزت کا آپس میں

Marfat.com

کیا تعلق ہے؟ جو لوگ عزت کمانے کے لیے شہرت کے پیچھے بھاگتے ہیں، کیا وہ کامیاب ہوتے ہیں؟ انسانی زندگی کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ شہرت اور عزت کا آپس میں کوئی خاص رشتہ نہیں۔ ایک عزت کسی کے خوف، مرتبے، ایزا رسانی کی صلاحیت، دولت کی چمک اور حکمرانوں کے دربار سے وابستگی سے ملتی ہے، لیکن یاد رکھیے ایسی عزت مصنوعی ہوتی ہے، کیوں کہ وہ نہ دل سے نکلتی اور نہ ہی دل میں جگہ پاتی ہے۔ وہ وقتی مفادات یا وقت کے تقاضوں سے جنم لیتی ہے اور حالات وضروریات بدلتے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ ہر زمانے میں کچھ غنڈے، سلطانہ ڈاکو، امرا، سمگلر اور وارداتیے مشہور رہے ہیں۔ لوگ خوف یا ضرورت کے مارے انھیں عزت کے گمان میں بھی بتلا رکھتے رہے ہیں، لیکن زندگی کا ورق اُلٹتے ہی، ان کی شہرت ان کی یاد کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ تاریخ میں تو شہرت اور جگہ صادق و جعفر کو بھی حاصل ہے، لیکن کس حیثیت میں اور کس حیثیت سے؟ وقت نے انھیں قومی غداری کی علامت بنا دیا ہے، جب کہ ان کے مقابلے میں ٹیپو سلطان شہید جرات و بہادری اور قومی حمیت کی علامت بن چکا ہے۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ عزت وذلت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی دین ہے۔ عزت وذلت منشائے الٰہی کے تابع ہیں۔ موٹی سی بات ہے کہ جو چیز منجانب اللہ ہو، منشائے الٰہی کے تابع ہو وہ یقیناً مقدر کا حصہ ہوتی ہے۔ مقدر کیا ہے؟ مقدر منشائے الٰہی ہے، لیکن قدرت نے خاصی حد تک مقدر انسانی کارناموں، جدوجہد، محنت اور خلوص سے منسلک کر دیا ہے۔ خلوص سے مراد خدمت ہے، کیوں کہ منشائے الٰہی خدمت کے جذبات سے ملتی ہے، نیت سے حاصل ہوتی ہے، کامیابی چھوٹی یا بڑی یا بہت بڑی مقدر سے جنم لیتی ہے۔ خدمت کی کئی قسمیں ہیں۔ خدمت سیاسی، اَدبی، معاشرتی، تعلیمی، فلاحی، سائنسی، دینی، انسانی وغیرہ وغیرہ شعبوں میں تقسیم ہو کر انسانی زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔ قوم کو آزادی دلانے والی سیاست ہو یا خوشحال بنانے والی معاشی تحریک، اندھیروں میں روشنی پھیلانے والی سائنسی ایجادات ہوں یا موذی امراض سے شفا دینے والی ایجادیں، قومی جذبات اور فوری بیدار کرنے والی شاعری ہو یا اَدب، قوم کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے والی علمی و تعلیمی تحریک ہو یا غربت و محرومی کے زخموں پر مرہم رکھنے والے ادارے یہ سب صدقہ جاریہ ہیں اور مقدر کا حصہ ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو شہرت یا کسی خدمت کے جذبے سے جنم لیتی اور پھیلتی ہے وہ پائیدار اور اَبدی عزت کا ذریعہ بنتی ہے اور جو عزت اَبدی روپ دھارتی ہے، وہ منجانب اللہ ہوتی ہے۔ باقی ہوا کا جھونکا، آیا اور گزر گیا۔

Marfat.com

غزوۂ بدر

رمضان مبارک قریب آتا ہے، تو مجھے ہمیشہ غزوہ بدر یاد آتا ہے، کیوں کہ 2 ہجری کے رمضان مبارک میں ہی غزوہ بدر برپا ہوا اور 2 ہجری میں ہی رمضان کا روزہ اور صدقہ فطر فرض ہوا۔ یہ بھی ایک خوش گوار اتفاق تھا کہ مسلمانوں نے اپنی زندگی میں پہلی عید بھی شوال 2 ہجری میں ہی منائی، جو جنگ بدر کی فتح مبین کے بعد پیش آئی۔

ہوسکتا ہے آپ غزوہ بدر کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں، اس صورت میں یادیں تازہ ہوجائیں گی، ورنہ معلومات میں اضافہ ہوجائے گا، کیوں کہ قارئین کو کتابیں پڑھنے کا وقت کم ہی ملتا ہے۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ اور مشرکین کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اسلامی لشکر نے بدر کے قریب نزول فرمایا اور معرکے ایک روز قبل حضور نبی کریمؐ نے اپنے لشکر کو حرکت دی تاکہ مشرکین سے پہلے بدر کے چشمے پر پہنچ جائیں۔ اس موقع پر حضرت حبابؓ بن منذر نے ایک ماہر فوجی کی حیثیت سے دریافت کیا کہ یارسول اللہؐ کیا اس مقام پر آپ اللہ کے حکم سے نازل ہوئے ہیں یا اسے محض جنگی حکمت عملی کے طور پر اختیار کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا جنگی حکمت عملی کے طور پر، انھوں نے کہا یہ مناسب جگہ نہیں ہے، آپ آگے تشریف لے چلیں اور قریش کے سب سے قریب جو چشمہ ہو اس پر پڑاؤ ڈالیں، پھر ہم بقیہ چشمے پاٹ دیں گے اور قریش کو پانی نہیں ملے گا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا تم نے بہت ٹھیک مشورہ دیا، پھر آپؐ نے قریب ترین چشمہ پر پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ صحابہ کرامؓ نے حوض بنایا اور باقی تمام چشموں کو بند کردیا۔ گویا باہمی صلاح و مشورہ ضروری ہے اور اچھی تجویز اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔

اللہ عزوجل نے اسی رات بارش نازل فرمائی جو مشرکین پر موسلا دھار برسی اور ان کی پیش قدمی میں رکاوٹ بن گئی، لیکن مسلمانوں پر پھوار کے مانند برسی اور انھیں پاک کرگئی۔ اس کی وجہ سے زمین

Marfat.com

میں سختی آ گئی اور مسلمانوں کے قدم ٹکنے کے لائق ہو گئے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے لشکر کی ترتیب فرمائی اور میدان جنگ میں تشریف لے گئے۔ وہاں آپؐ اپنے ہاتھ سے اشارہ فرماتے جا رہے تھے کہ یہ جگہ کل فلاں کی قتل گاہ ہے اور انشاء اللہ یہ جگہ کل فلاں کی قتل گاہ ہے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے وہیں ایک درخت کی جڑ کے پاس رات گزاری۔ مسلمانوں کے دل اعتماد کے نور سے منور تھے۔ یہ شب جمعہ 17 رمضان کی رات تھی اور آپؐ اس مہینے کی آٹھ یا بارہ کو مدینے سے روانہ ہوئے تھے۔ دوسری طرف قریش نے وادی کے دہانے کے باہر اپنے کیمپ میں رات گزاری۔ ایک گروہ رسول اللہؐ کے حوض کی جانب بڑھا۔ آپؐ نے فرمایا انھیں چھوڑ دو، مگران میں سے، جس نے بھی پانی پیا وہ اس جنگ میں مارا گیا۔ صرف حکیم بن حزام باقی بچا جو بعد میں بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا۔

جب مشرکین کا لشکر نمودار ہوا تو رسول اللہؐ نے فرمایا "اے اَللّٰہ یہ قریش ہیں، جو اپنے غرور و تکبر کے ساتھ تیری مخالفت کرتے اور تیرے رسولؐ کو جھٹلاتے ہوئے آئے ہیں۔ اے اَللّٰہ تیری مدد...... جس کا تو نے وعدہ کیا ہے۔ اے اَللّٰہ آج انھیں اینٹھ کر رکھ دے" اس معرکے کا پہلا ایندھن اسود بن عبدالاسد مخزومی بنا جو بڑا بدخلق انسان تھا۔ وہ اعلان کرتے ہوئے نکلا میں ان کے حوض کا پانی پی کر رہوں گا۔ اِدھر سے حضرت حمزہؓ نکلے اور اسے تلوار سے قتل کر کے ڈھیر کر دیا۔ جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی۔ قریش کے تین بہترین شہسوار نکلے۔ مقابلے کے لیے انصار کے تین نوجوان آئے۔ قریشیوں نے مطالبہ کیا کہ ہمارے پاس ہماری قوم کے ہمسروں کو بھیجا جائے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "عبیدہؓ بن حارث اُٹھو، حمزہؓ اُٹھیے، علیؓ اُٹھو، حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ نے اپنے مدمقابل کو جھٹ مار لیا، لیکن عبیدہؓ کے مدمقابل کے درمیان ایک ایک وار کا تبادلہ ہوا۔ دونوں کو گہرے زخم لگے۔ اتنے میں حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ فارغ ہو کر مشرک عتبہ پر ٹوٹ پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ تین بہترین شہ سواروں کو کھونے کے بعد مشرکین غیض و غضب سے حملہ آور ہوئے۔ گھمسان کا رن پڑا، تو آپؐ دُعا میں انتہائی خضوع و خشوع سے مصروف تھے، پھر وحی نازل ہوئی، ترجمہ (میں ایک ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا، جو آگے پیچھے آئیں گے) اس کے بعد رسول اللہؐ کو ایک جھپکی آئی۔ آپؐ نے سر اُٹھایا اور فرمایا ابوبکر خوش ہو جاؤ۔ یہ جبرئیل ہیں۔ اس کے بعد آپؐ چھپر سے باہر تشریف لائے۔ آپؐ نے ایک مٹھی کنکریلی مٹی لی اور قریش کی جانب پھینک دی، پھر مشرکین میں سے کوئی بھی نہ تھا، جس کی دونوں آنکھوں، نتھنوں اور منہ میں اس مٹی سے کچھ نہ کچھ گیا ہو۔ پُر جوش لڑائی میں فرشتوں نے بھی مدد فرمائی، چناں چہ ابن سعد کی روایت میں حضرت عکرمہؓ سے مروی ہے کہ اس دن آدمی کا سر کٹ کر گرتا اور پتا نہ چلتا کہ اسے کس نے مارا، ہاتھ کٹ کر گرتا اور پتا

Marfat.com

نہ چلتا اسے کس نے کاٹا۔ ایک انصاری حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کو قید کر کے لایا گیا، تو حضرت عباسؓ کہنے لگے ''واللہ مجھے اس نے قید نہیں کیا ہے، مجھے تو ایک بے بال کے سر والے آدمی نے قید کیا ہے، جو نہایت خوبرو تھا اور چتکبرے گھوڑے پر سوار تھا۔ معرکہ ختم ہوا تو رسول اللہؐ نے فرمایا ''ابوجہل کا انجام کیا ہوا؟'' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کا سر کاٹا اور آپؐ کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا چلو مجھے اس کی لاش دکھاؤ۔ لاش دیکھ کر آپؐ نے فرمایا یہ اس اُمت کا فرعون تھا۔ غزوہ بدر معرکہ حق و باطل تھا، جس میں حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو، جو اس وقت مشرکین کے ساتھ تھا، پکار کر کہا او خبیث میرا مال کہاں ہے۔ عبدالرحمٰن نے کہا ہتھیار تیز رو گھوڑے اس تلوار کے سوا کچھ باقی نہیں، جو بڑھاپے کی گمراہی کا خاتمہ کرتی ہے۔ اس جنگ میں خونی رشتے باطل ٹھہرے اور مذہبی و دینی رشتے اصل رشتے قرار پائے۔ جنگ کے دوران حضرت عکاشہ بن محصن اسدیؓ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ رسول اللہؐ نے انھیں لکڑی کا ایک پھٹا تھما دیا۔ عکاشہؓ نے اسے ہلایا تو وہ ایک لمبی مضبوط اور چم چم کرتی سفید تلوار میں تبدیل ہو گیا۔ یہ تلوار مستقل طور پر حضرت عکاشہؓ کے پاس رہی اور وہ اسے بعد ازاں شہادت تک استعمال کرتے رہے۔ مشرکین کی لاشوں کو کنویں میں ڈالا جا رہا تھا تو عتبہ بن ربیعہ کی لاش کو گھسیٹ کر لایا گیا۔ رسول اللہؐ نے اس کے صاحبزادے حضرت ابوحذیفہؓ کو دیکھا، تو غمزدہ لگے۔ آپؐ نے فرمایا ''غالباً اپنے والد کے سلسلے میں تمھارے دل کے اندر کچھ احساسات ہیں'' انھوں نے کہا ''نہیں واللہ یا رسول اللہ میرے اندر اپنے باپ کے قتل کے بارے میں ذرا بھی لرزش نہیں''۔ اس پر حضورؐ نے حضرت ابوحذیفہؓ کے لیے دُعا فرمائی۔

تفصیلات کو اختصار کے کوزے میں بند کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ غزوہ بدر جو اسلام اور کفر کے درمیان پہلا عظیم اور فیصلہ کن معرکہ تھا، اپنے اندر بے شمار روشن ''سبق'' سموئے ہوئے ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر رضائے الٰہی حاصل اور شامل ہو تو تعداد اور اسلحہ کوئی معانی نہیں رکھتا، اسلام میں رشتے خون سے نہیں، بل کہ دین سے طے ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں، اگر شوق شہادت زندہ اور روشن ہو، تو انھیں کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی، تکبر، غرور اور شرک بالآخر خاک میں ملتا اور رسوا ہوتا ہے، جو لوگ معجزات اور غیبی مدد کے بارے میں شکوک میں مبتلا رہتے ہیں، انھیں غزوہ بدر کی تفصیلات کو غور سے پڑھنا چاہیے اور غور کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ بدر کی فتح نے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ دی اور پھر اس کے بعد اسلام کرۂ ارض پر اس قدر تیزی سے پھیلا کہ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

Marfat.com

عید میلاد النبیؐ...... کیوں کر اور کیسے؟

سیاست پر تجزیات کا سمندر بہہ رہا ہے، اس لیے بار بار سیاسی حالات کو مشق ستم بنانا باعث تسکین نہیں ہوتا۔ کوشش کرتا ہوں ایسے موضوعات پر لکھوں، جن سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہو یا ان کو غور وفکر سامان یا روحانی لذت ملے۔ ضروری نہیں ہر کوشش کامیاب ہو، لیکن کوشش کرتے رہنے میں کیا حرج ہے؟ مزاج کی مجبوری ہے کہ صرف اسی موضوع پر لکھ سکتا ہوں جو میرے اندر سے اُبھرے اور ذہن پہ چھا جائے۔ میں ہرگز مذہبی سکالر نہیں، اس لیے اس میدان میں قدم رکھتے ہوئے میرے الفاظ کے پَر جلتے ہیں۔ مذہبی حوالے سے ہم اتنے مسالک فرقوں اور خانوں میں تقسیم ہو چکے ہیں کہ درگزر، برداشت اور اختلافی بات سننے کا حوصلہ تقریباً دم توڑ چکا ہے۔ شدت پسندی ہمارے مزاج پر اس قدر حاوی ہو چکی ہے کہ ہر مسلک دوسرے کا گلہ کاٹنے کے لیے اپنے دلائل اور فتاویٰ کی تلوار سونتے کھڑا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آخری نبیؐ اور گناہ گاروں کے آقا و سہارا کی سیرت عفوو درگزر، صبر، برداشت، تحمل، بردباری، اللہ کی مخلوق سے پیار اور حسن سلوک کا بار بار پیغام دیتی ہے۔ دراصل یہی خوبیاں مل کر حسن سلوک کہلاتی ہیں اور حسن سلوک ہی مسلمان کی روح ہے۔ ہم ان سے محروم ہو کر اور شدت پسندی کا شکار ہو کر نہ صرف باطنی اور ذہنی طور پر منقسم ہو چکے ہیں، بل کہ ہماری حالت وہی ہے، جو رُوح سے خالی جسم کی ہوتی ہے۔ جس اتحاد، بھائی چارے اور یکجہتی کا پیغام اللہ پاک نے دین اسلام کے ذریعے اپنے محبوبؐ کے توسط سے دیا تھا، اسے ہمارے اختلافات نے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اُمت محمدیؐ کبھی ایک جسم کے مانند تھی، لیکن مذہبی منافرت کے طفیل آج بہت سے چھوٹے چھوٹے جسموں یا اجسام میں بٹ چکی ہے۔ میں کبھی کبھی فتوے پڑھ کر سوچتا ہوں، اگر ہمارا مذہب، دین اور اسوہ حسنہ ہمیں متحد نہیں کر سکے، تو پھر آخر وہ کون سا جذبہ اور سوچ ہوگی، جو

Marfat.com

مسلمانوں کو باطنی اتحاد کے رشتے میں منسلک کر سکے؟ کیا کبھی سوچا آپ نے کہ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے اور مذہبی وفرقہ وارانہ تقسیم اور کشمکش کا علاج کیا ہے؟

آج 12 ربیع الاول ہے۔ ہمارے لیے حد درجہ مسرت کا دن ہے۔ یوم عید ہے کہ نبی کریمؐ کی ولادت کا دن ہے۔ ہم حضور نبی کریمؐ کی نگاہ اور تعلیمات کے صدقے مسلمان ہیں، اُمت محمدیؐ ہیں اور ہمیں اس پہ فخر ہے، لیکن کتنی بدقسمتی ہے کہ ہم سیرت نبویؐ سے نہ روشنی حاصل کرتے ہیں، نہ خلوص نیت سے اتباع کرتے ہیں اور اسی کا نتیجہ یہ باہمی منافرت اور تفریق ہے۔ میں نے عرض کیا نا کہ میں ہرگز مذہبی سکالر نہیں، اس لیے میدان میں قدم رکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ 12 ربیع الاول کے حوالے سے مواد کھنگالتے ہوئے مجھے کچھ ایسی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، جنھیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہا، اگر اس سے قبل آپ انھیں پڑھ چکے ہیں، تو قندمکرر سمجھ لیں، ورنہ شاید ان کے مطالعے سے آپ کی معلومات میں تھوڑا سا اضافہ ہو۔ عید میلادالنبیؐ کے ضمن میں جس واقعے کا عالم اسلام اور خاص طور پر عرب ممالک کے ممتاز سکالرز نے بہت ذکر کیا ہے، وہ ہے ابولہب کا خواب...... یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ابولہب حضورؐ کا چچا تھا، لیکن نبوت کے اعلان کے بعد سب سے بڑا دشمن بن گیا۔ حتیٰ کہ ابولہب کے حوالے سے ایک آیت بھی نازل ہوئی، جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے بھی اسی خواب کا ذکر کیا ہے۔ روایت یوں ہے کہ ابولہب کے مرنے کے بعد اس کے بھائی حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے اسے خواب میں بری حالت میں دیکھا، تو پوچھا تیرا کیا حال ہے۔ اس نے کہا: آگ میں جل رہا ہوں تاہم ہر پیر کے دن میرے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔ اُنگلی کے اشارہ سے کہنے لگا کہ میری ان دو اُنگلیوں کے درمیان سے پانی (کا چشمہ) نکلتا ہے، جسے میں پی لیتا ہوں اور یہ تخفیف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ میں نے ثوبیہ کو آزاد کیا تھا، جب اس نے مجھے محمدؐ کی ولادت کی خوشخبری دی تھی اور اس نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔ ثوبیہ ابولہب کی لونڈی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ابولہب کو اپنے بھتیجے کی ولادت کی خوشخبری سنائی تھی، تو ابولہب نے خوش ہو کر اسے فوراً آزاد کر دیا تھا۔ اسی ثوبیہ نے بعدازاں نبی کریمؐ کو دودھ پلایا اور تاریخ اسلام میں معزز ہو گئیں، چناں چہ اکثر عالم وفاضل مصنفین لکھتے ہیں کہ پس جب حضور نبی اکرمؐ کی ولادت باسعادت کے موقع پر خوشی منانے کے اَجر میں اس ابولہب کے عذاب میں بھی تخفیف کر دی جاتی ہے، جس کی مذمت میں قرآن حکیم میں ایک مکمل سورت نازل ہوئی ہے، تو امت محمدیہ کے توحید پرست مسلمانوں کو ملنے والے اَجر وثواب کا کیا عالم ہوگا، جو آپؐ کے میلاد کی خوشی مناتا ہے۔ یہ مصنفین محافل

Marfat.com

میلاد کے علاوہ ذکر، درود وسلام، صدقہ وخیرات اور اعمال صالحہ میں زیادتی پر زور دیتے ہیں۔

حکیم الامت علامہ محمد اقبال عاشق رسولؐ اور مفسر قرآن تھے۔ ان کا تعلق، چوں کہ عصر حاضر سے ہے، اس لیے ان کا نقطہ نظر جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ فرماتے ہیں "منجملہ ان مقدس ایام کے، جو مسلمانوں کے لیے مقدس کیے گئے ہیں، ایک میلاد النبیؐ کا دن بھی ہے۔ میرے نزدیک انسانوں کی دماغی وقلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رُو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے، چناں چہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسول کو مدنظر رکھیں تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے۔ ان جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریق تو درود وصلوٰۃ ہے، جو مسلمانوں کی زندگی کا جز ولاینفک ہو چکا ہے۔ وہ ہر وقت درود پڑھنے کے مواقع نکالتے ہیں۔ پہلا طریق انفرادی دوسرا اجتماعی ہے، یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص، جو حضور آقائے دو جہاںؐ کے سوانح حیات سے پوری طرح باخبر ہو، آپ کی سوانح زندگی بیان کرے تاکہ ان کی تقلید کا ذوق شوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو۔ اس طریق پر عمل پیرا ہونے کے لیے آج ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔ تیسرا طریق، اگرچہ مشکل ہے، لیکن بہ ہر حال اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ وہ طریقہ ہے کہ یاد رسولؐ اس کثرت سے اور اس انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے، یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضور سرور عالمؐ کے وجود مقدس سے ہویدا تھی، وہ آج بھی تمھارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے"......آپ عید میلاد النبی کیوں کر اور کیسے مناتے ہیں اور آپ اس تحریر سے کیا سمجھے، اسے میں آپ پر ہی چھوڑتا ہوں۔

Marfat.com

تاریخ کی کرامات

عام طور پر تاریخ کا سفر اتنا طویل ہوتا ہے کہ صبح ہونے تک دہائیاں اور شام ہونے تک صدیاں گزر چکی ہوتی ہیں۔ صدیاں گزر چکیں، لیکن ابھی تک مغلیہ خاندان کے دور حکومت پر تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ابھی پاکستان کو معرض وجود میں آئے تقریباً 68 برس ہی گزرے ہیں اور بانی پاکستان پر کتابوں کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ امریکا، انگلستان، کینیڈا، ہندوستان اور پاکستان میں قائداعظم پر گہری تحقیق کا سلسلہ جاری ہے اور ہر روز نئی کتابیں مارکیٹ میں آ رہی ہیں۔ پاکستانی ہونے اور قائداعظم سے محبت کے ناطے میں اسے حد درجہ اہمیت دیتا ہوں، کیوں کہ قائداعظم ہی دراصل تحریک پاکستان اور قیام کا کا تعارف ہیں اور تقسیم ہند کا جواز ہیں۔ آج سے چھ دہائیاں قبل صورت مختلف تھی۔ ہندوستان اور گاندھی نہرو پر دھڑا دھڑ کتابیں لکھی جا رہی تھیں اور پاکستان اور قائداعظم کا عالمی سطح پر تعارف بہت کم تھا، جن دنوں پوسٹ آفس اور پوسٹل نظام خط و کتابت کا مؤثر واحد ذریعہ تھا، ان دنوں میں نے بے شمار خطوط دیکھے، جن پر لاہور، ہندوستان کا پتا لکھا گیا تھا، حالاں کہ پاکستان بنے پندرہ سولہ برس گزر چکے تھے اور ایوب خان کا دور دورہ تھا۔ گزشتہ چند برسوں میں تاریخ نے کروٹ لی ہے اور اب صورت کچھ یوں ہے کہ نہرو اور گاندھی سے کہیں زیادہ تحقیقی کام قائداعظم پر ہو رہا ہے اور نت نئی کتابیں عالمی مارکیٹ میں آ رہی ہیں۔ ہمارے لیے خوش آیند بات یہ ہے کہ نئے سکالرز اور مصنفین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ قائداعظم بہ ہر حال گاندھی، نہرو سے زیادہ عظیم، ذہین، باکردار اور بڑے سیاسی لیڈر تھے اور انھوں نے اپنی حکمت عملی سے بہ یک وقت انگریز حکومت اور کانگریسی سیاست کے اہداف کو شکست دے دی۔ امریکی مورخ سٹینلے والپرٹ سے اکثر مصنفین متفق نظر آتے ہیں کہ اتنے باصلاحیت،

Marfat.com

باکردار، ذہین اور بصیرت افروز لیڈران عالمی تاریخ میں کم کم قوموں کو نصیب ہوئے، جنھوں نے نہ صرف تاریخ پر انمٹ نقوش مرتب کیے، بل کہ دنیا کا نقشہ ہی بدل ڈالا اور ہاں ہمارے لیے ایک مقام شکر یہ بھی ہے کہ جب نہرو ماؤنٹ بیٹن اور گاندھی جیسی شخصیات پر جنسی حوالے سے الزامات ثابت کیے جارہے ہیں، ان کے معاشقوں کی داستانیں شواہد اور ریکارڈ سے ثابت کی جارہی ہیں اور ان پر مکروفریب اور بعض اوقات جھوٹ کے بھی الزامات لگ رہے ہیں، تو قائداعظم ایک صاف ستھرے، روشن اور عظیم کردار کے طور پر اُبھر رہے ہیں۔ کوئی ریسرچ سکالر آج تک یہ نہیں لکھ سکا کہ قائداعظم نے کبھی غلط بیانی کی ہو اور کمزور کردار کا مظاہرہ کیا ہو۔ قائداعظم نہایت خوبرو، دولت مند، نہایت خوش لباس اور شہرت کی بلندیوں پر اڑنے والی کرشماتی شخصیت تھی، ان کی ذہانت و فطانت کے ہندوستان میں چرچے تھے، لیکن مجال ہے کہ آج تک ان کے دامن پہ کوئی چھینٹا پڑا ہو اور کسی نے ان پر کسی غیر عورت سے رومانس اور غیر شرعی تعلقات کا الزام یا بہتان لگایا ہو۔ انھوں نے سرڈنشا کی بیٹی رتی کو پسند کیا۔ خود رتی جناح کو بھی تھوڑی سی شکایت تھی کہ جناح ہندوستانی لوگوں کے مانند گرم جوش نہیں اور کبھی بھی ہوش کا دامن ڈھیلا نہیں ہونے دیتے۔ رتی کی اپنی خواہش تھی کہ وہ جناح کی رفیق حیات بنے۔ جب وہ اٹھارہ برس کی ہوگئی اور قانون کے مطابق بالغ ٹھہری تو قائداعظم نے اسے مشرف بہ اسلام کیا اور اسلامی شرعی طریقے سے نکاح کرلیا۔ یہ شادی کوئی ایک دہائی تک چلی اور اختلافات کی نذر ہوگئی، جس میں سب سے اہم فیکٹر قائداعظم کی سیاسی مصروفیت یا عدیم الفرصتی تھی، کیوں کہ وہ زندگی مسلمان قوم کے لیے وقف کر چکے تھے اور ہر لحہ قوم کے روشن مستقبل کے لیے جدوجہد میں مصروف رہتے تھے، جب کہ نوجوان، تعلیم یافتہ، ماڈرن اور خوب صورت رتی ہمہ وقت خاوند کی توجہ چاہتی تھی۔ رتی سے اختلافات اور اس کے انتقال کے بعد نہ کبھی کوئی خاتون ان کے قریب آئی اور نہ ہی انھوں نے کسی پر نظر التفات ڈالی، حالاں کہ بہ قول ایک مصنف نظر التفات کی منتظر ایک دنیا تھی۔ ان کے مقدر میں بابائے قوم بننا لکھا تھا، چناں چہ انھوں نے جوانی ہی میں بابائے قوم کا رتبہ سنبھال لیا۔ ان کی زندگی میں عورت کے خلا کو ان کی عظیم بہن مس فاطمہ جناح نے پُر کیا اور اپنی زندگی اپنے بھائی اور بھائی کی منزل اور جدوجہد کے لیے وقف کر کے اپنی جوانی اور زندگی اس کی نذر کردی۔ اس عظیم بہن کا کردار بھی اتنا اُجلا اور روشن تھا کہ لوگ رشک کرتے تھے۔ ان کے مقدر میں بھی مادر قوم بننا لکھا تھا اور وہ مادر قوم ہو کر تاریخ میں امر ہوگئیں۔ بشری کمزوریوں سے پاک ذات صرف پیغمبروں نبیوں کی ہوتی ہے۔ انسان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس میں مزاج کی بعض کمزوریاں ضرور ظاہر ہو

Marfat.com

جاتی ہیں۔ یہ کمزوریاں کسی حد تک ان میں بھی تھیں۔کوئی سرد مہری اور تنہائی پسندی کا الزام دیتا ہے،تو کوئی سخت مزاجی کا،لیکن آج تک کسی مائی کے لال نے ان کے کردار،حق گوئی،ایمان داری،قوم کے لیے ایثار اور کمٹمنٹ پر اُنگلی نہیں اُٹھائی اور نہ ہی ان کے اُجلے دامن پر کوئی چھینٹا پھینکا ہے۔

یارو معاف کرنا! میں اسے صرف مسلمانانِ ہند کی خوش قسمتی ہی نہیں سمجھتا کہ انھیں قومی زندگی کے فیصلہ کن موڑ پر ایک ایسا لیڈر ملا،جس کے سامنے دوسری اقوام کے لیڈران ماند پڑ گئے ہیں،بل کہ میرے نزدیک یہ ایک کرامت ہے کہ جب ہندوستان کے باقی لیڈروں پر جنسی،سیاسی اور ذاتی حوالے سے الزامات ثابت کیے جارہے ہیں،تو قائداعظم پر ان کے شدید ترین مخالف بھی الزام لگانے سے معذور ہیں۔آج کی اپنی قیادت پر نظر ڈالیں،جن کی ماشاﷲ تعداد کئی درجن ہے۔کسی پر دولت بنانے،عہدے سے ناجائز فائدہ اُٹھانے،اقربا پروری،نااہلی اور کم بصیرتی،بکاؤ مال،امریکا پرستی،غلط بیانی،بے اصولی،لوٹ مار کرپشن وغیرہ وغیرہ کے الزامات ہیں،تو کسی پر جنسی تعلقات،ہوس اقتدار،خود پرستی،بے ایمانی،غداری اور سکیورٹی رسک وغیرہ ہونے کے حوالے سے الزامات ہیں۔آپ کی نظروں کے سامنے لوگوں نے سیاست کے لبادے میں سونے کے ڈھیر لگا لیے،دولت کے انبار اکٹھے کر لیے،صنعتی و کاروباری سلطنتیں بڑھا اور پھیلا لیں،اندرون بیرون ملک محلات بنا لیے،غیر ملکی بینکوں میں موٹے موٹے اکاؤنٹ محفوظ کر لیے،لیکن قائداعظم نے اپنی محنت اور ذہانت سے جو کمایا تھا،وہ بھی قوم کو دے دیا۔نہ قومی خزانے پر بوجھ ڈالا،نہ کسی کے مرہون منت یا مرہون احسان ٹھہرے اور زندگی ہی میں عمر بھر کی کمائی بمبئی،دہلی،علی گڑھ،کراچی،پشاور وغیرہ وغیرہ کے تعلیمی اداروں اور یتیم خانوں میں تقسیم کر دی۔کچھ حصہ اپنی بہن اور بیٹی کے لیے رکھا کہ وہ ان کا شرعی فرض تھا،باقی قوم کو دے دیا۔یارو! ہے نا یہ کرامت؟ مورخین اسے تاریخ کی کرامت کہتے ہیں،کیوں کہ ایسی مثالیں انسانی تاریخ میں کم کم ملتی ہیں۔علامہ اقبال ٹھیک ہی فرماتے ہیں،بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

Marfat.com

تاریخی جھروکے......دل کے داغ جل اُٹھے

عام طور پر ایسے موضوعات پر لکھتے ہوئے، میں ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اول تو اس لیے کہ گناہوں پر پردہ پوشی کا حکم ہے اور دوم اس لیے کہ جو شخصیات اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں، ان کے بارے میں اچھی بات کرنی چاہیے۔ مشکل یہ ہے کہ سیاست دان حکمران وغیرہ پبلک پراپرٹی ہوتے ہیں، یعنی وہ عوام کی ملکیت ہوتے ہیں اور اسی ناطے تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں، اس لیے، اگر انھیں بھلا دیا جائے یا پس پشت ڈال دیا جائے، تو تاریخ نویسی کا کام ٹھپ ہو جائے گا اور تاریخ کسی قوم کا حافظہ سمجھی جاتی ہے، اس لیے تاریخ کے سفر کو ہمیشہ جاری وساری رکھنا نہایت ضروری ہے، اگر کسی تاریخی شخصیت کے کردار اور کارناموں یا ناکامیوں کا تجزیہ نہ کیا جائے تو پھر تاریخ سے سبق سیکھنا چہ معنی؟ دراصل حکمرانوں کی ناکامیوں کا تجزیہ قوموں کی ذہنی تربیت اور شعور اُجاگر کرنے کا حصہ ہوتا ہے، اس لیے اس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ اسی طرح جب کسی قابل عبرت کردار اور ناکام حکمران کا ذکر کرتے ہوئے، اس کی متوازن تصویر پیش کی جائے اور اس کی کمزوریوں کا دفاع کیا جائے، تو اس کی تصحیح بھی لازم ہو جاتی ہے۔

1971ء میں پاکستان کا ٹوٹنا ایک ایسا سانحہ ہے، جس نے ہماری قومی نفسیات پر انمٹ اور گہرے نقوش مرتب کیے ہیں اور ہمارے قومی اعتماد پر چرکے لگائے ہیں۔ اتنے بڑے سانحے کے ذمہ داران تو کئی سیاسی کردار اور بہت سے عوامل ہوتے ہیں، لیکن بہ ہر حال بنیادی ذمہ داری اس حکمران کی

Marfat.com

تصور ہوتی ہے، جس کے ہاتھوں میں عنان کردار تھی۔ مجھے یہ تحریر لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ گزشتہ دنوں بعض لکھاریوں نے تحقیق کیے بغیر یہ واضح تاثر پیدا کیا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یحیٰی نے پاکستان کو جام شراب میں ڈبو کر توڑ دیا اور یہ کہ یحیٰی خان نہایت عیاش اور نا ؤ نوش کا عادی تھا یہ سب کچھ صحیح نہیں، یہ مخالفوں کا پراپیگنڈہ اور پریس کا کیا دھرا ہے۔ بالواسطہ طور پر سارا الزام پریس پر تھوپ کر یحیٰی خان کے دامن کے دھبے دھو دیے گئے۔ یہ ایک ایسے حکمران کی غیر حقیقی تصویر کشی ہے، جو کلی اختیار کا مالک ہونے کے باوجود ملک کو ٹوٹنے سے بچا نہ سکا، بل کہ جس کی اپنی پالیسوں، سیاسی چالوں اور ہوس اقتدار نے اس عظیم سانحے کی راہ ہموار کی۔ ون یونٹ کو توڑنا، ون مین ون ووٹ کا فیصلہ کر کے انتخابات کروانا اور پھر اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر کے انتقال اقتدار کا راستہ روکنا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اہم ترین ''سنگ میل'' ہیں۔ یہ ایسے بنیادی فیصلے ہیں، جن کے سبب ملک ٹوٹ گیا۔ بعدازاں ہائی کورٹ میں داخل کیے گئے حلف نامے میں یحیٰی خان نے بیان دیا کہ میں بھٹو کے کہنے پر فیصلے کرتا رہا، حالاں کہ ون یونٹ توڑنا اور ون مین ون ووٹ کے فیصلے شیخ مجیب الرحمٰن کو خوش کرنے کے لیے کیے گئے تھے اور اس سودہ بازی کا حصہ تھے، جس کے طفیل انتقال اقتدار کے بعد بھی یحیٰی خان کو صدارت کی کرسی پر متمکن رہنا تھا۔

یحیٰی خان سیاستدان ہوتا تو وہ ان فیصلوں کو معرض وجود میں آنے والی دستور ساز اسمبلی پر چھوڑتا اور گزشتہ دستور ساز اسمبلی کے منظور کردہ ون یونٹ اور پیرٹی کے اصولوں کو نہ چھیڑتا، کیوں کہ انھیں مشرقی پاکستان کے نمایندوں کی حمایت سے پاس کیا گیا تھا۔ اسمبلی کے اجلاس کا التوا شاید بھٹو کے مشورے پر کیا گیا، لیکن سوال یہ ہے آمر حکمران نے یہ مشورہ کیوں مانا؟ ایک عام شہری کو بھی اندازہ تھا کہ اس فیصلے کے خلاف شدید ترین ردعمل ہوگا، سول نافرمانی کی وبا پھوٹ پڑے گی، تو کیا یحیٰی خان اقتدار میں ایک سال گزارنے کے باوجود اتنا سادہ تھا کہ آنے والے طوفان کو نہ دیکھ سکا۔ چلیے اس بحث کو رہنے دیجیے کہ اس پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

پھر یہ بھی تاثر اُبھارا گیا کہ یحیٰی خان کی بلا کی شراب نوشی، جو اس گمبھیر صورت حال کی ایک وجہ بنی، محض پراپیگنڈہ ہے اور یہ بھی پراپیگنڈہ ہے کہ یحیٰی خان نے ایوب خان سے استعفٰی لینے کے لیے سازشوں کا جال بُنا۔ ''پاکستان کیوں ٹوٹا'' پر تحقیق کے دوران، میں نے کئی عینی شاہدوں کے انٹرویو کیے تھے، جنھوں نے تصدیق کی کہ یحیٰی خان نہ صرف مولانا بھاشانی کی گھراؤ جلاؤ تحریک کی حوصلہ افزائی کا ذمہ دار تھا، بل کہ اس نے بیمار ایوب خان کو بھی ''محدود'' کر دیا تھا۔ اس سارے منظر کی الطاف گوہر نے

Marfat.com

اپنی کتاب میں سبق آموز تصویر کشی کی ہے۔ظاہر ہے کہ خود الطاف گوہر عینی شاہد تھا۔اسے میں سبق آموز تصویر کشی اس لیے کہتا ہوں کہ عام طور پر تاریخ میں بادشاہوں اور آمروں کا انجام ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔خود ایوب خان بھی تو آمر تھے۔ یہ کہنا کہ یحییٰ خان پر شراب نوشی کا الزام محض پراپیگنڈہ ہے، تاریخی حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے آئی ایس پی کے ریٹائرڈ میجر اور ممتاز ادیب ابن الحسن نے ذاتی مشاہدات پر مبنی ایک خوفناک مضمون لکھا تھا، جو''نوائے وقت'' میں دوبار شائع ہوا۔ یہ مضمون خوفناک اس لیے تھا کہ اس نے میری رات کی نیند اُڑا دی۔ میجر ابن الحسن نے لکھا تھا کہ جب یحییٰ خان بریگیڈیئر تھا، تو اس نے حسب عادت اپنے ایک ماتحت میجر یا کرنل کی انگریز بیوی سے تعلقات استوار کر لیے تھے۔وہ افسر میجر ابن الحسن کا سرکاری گھروں میں پڑوسی تھا۔ بریگیڈیئر یحییٰ خان اس ماتحت افسر کو کبھی کبھار دورے پر بھجوا کر دفتری اوقات کے بعد اس گھر میں آجاتا، کئی گھنٹے عیاشی کرتا اور پھر شام کو کھانستا ہوا رخصت ہو جاتا۔اس فوجی افسر کا بیٹا میجر ابن الحسن کے بیٹے کا کلاس فیلو تھا۔وہ جب سکول سے واپس آتا اور بریگیڈیئر یحییٰ خان کی کار گھر کے باہر دیکھتا، تو اپنے کلاس فیلو کے ساتھ میجر ابن الحسن کے گھر آجاتا اور یحییٰ خان کی واپسی تک وہاں رہتا۔ ایک روز میجر ابن الحسن اور ان کی بیگم کی موجودگی میں وہ لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رو یا کہ اسے دلاسہ دینا ممکن نہ رہا۔یہی وہ واقعہ تھا، جس نے میری رات کی نیند اُڑا دی۔

یحییٰ خان عادی اور بلا کا شراب نوش تھا۔چودھری سردار محمد سابق آئی جی پنجاب نے مجھے یہ واقعہ خود بھی سنایا اور اپنی کتاب میں بھی لکھا ہے۔مرحوم چودھری سردار ڈی آئی جی پشاور تھے۔صدر اور سی ایم ایل اے جنرل یحییٰ خان پشاور تشریف لائے۔اپنے گھر میں ٹھہرے۔پروگرام کے مطابق انھیں صبح کہیں وزٹ پر جانا تھا۔پولیس افسران اور سرکاری حکام باہر کھڑے تھے اور صدر صاحب کی آمد میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔تشویش بڑھی تو ڈی آئی جی نے کھڑکیوں سے جھانکنا شروع کیا۔اتفاق سے ایک کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔چودھری سردار مرحوم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یحییٰ خان پاکستان کی ایک نامور حسین مغنیہ کے ننگے پیٹ پر شراب کے قطرے ڈال کر چاٹنے میں مگن تھا۔اس حوالے سے ایران کے ممتاز اخبار کیہان انٹرنیشنل نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا، جس کا حوالہ میری کتاب میں بھی ملتا ہے۔شہنشاہ ایران نے پہلوی خاندان کے اقتدار کو سرکاری سطح پر منانے کے لیے سربراہان ممالک کو تہران مدعو کیا۔ان دنوں روس پاکستان سے سخت ناراض تھا اور روسی صدر یحییٰ خان کو دھمکی آمیز خط بھی لکھ چکا تھا۔شاہ ایران نے روس اور پاکستان کے تعلقات میں بہتری لانے کے لیے دونوں سربراہان کی ملاقات کروائی۔روسی صدر نے یحییٰ

Marfat.com

خان کو ممکنہ جنگ کے حوالے سے وارننگ دی۔ یحییٰ خان شراب کے نشے میں دھت تھا۔ ''فرمایا'' میری ایک بٹالین روس اور ہندوستان دونوں کو شکست دینے کے لیے کافی ہے۔ اس فرمان نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پھر روس نے ہندوستان کے ساتھ مل کر پاکستان کو توڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہوا تو مشرقی پاکستان میں ہنگاموں کی آگ بھڑک اُٹھی۔ مغربی پاکستان سے ممتاز نمایندہ سیاست دانوں کا ایک وفد ڈھاکا پہنچا، شیخ مجیب الرحمٰن سے ملا اور پھر کوئی درمیانی راستہ نکالنے کے لیے یحییٰ خان سے ملاقات کا وقت لیا۔ یحییٰ خان گورنر ہاؤس میں مقیم تھا۔ یہ وفد مقررہ وقت پر گورنر ہاؤس پہنچا۔ کچھ تاخیر سے یحییٰ خان ملاقاتی کمرے میں تشریف لائے۔ سوئمنگ پول سے برآمد ہوئے تھے اور اسی طرح کے لباس میں ملبوس تھے۔ کندھے پہ تولیہ اور ہاتھ میں جام تھا۔ وفد کی بات سن کر فرمایا ''مجیب میری بیوی نہیں کہ میں اسے مناتا پھروں'' اسی رات آرمی ایکشن شروع ہو گیا۔ جب مرحوم ممتاز دولتانہ نے یہ آنکھوں دیکھا منظر بیان کیا تو سننے والے کانپ اُٹھے۔ اس وفد کے اراکین کا خیال تھا کہ اس وقت بھی پاکستان کو ٹوٹنے سے بچایا جا سکتا تھا جو آرمی ایکشن کے بعد ممکن نہ رہا۔

دوستو! یہ موضوع کالم میں نہیں سما سکتا۔ میں نے فقط اس تاثر کی تصحیح کرنے کی کوشش کی کہ یحییٰ خان پر عیاشی اور شراب نوشی کے الزامات مخالفین کا پراپیگنڈہ اور پریس کی مہم جوئی تھی۔ ایوب خان سے ٹیک اوور کرنے اور قوم سے خطاب کرنے کے بعد یحییٰ خان نے کس طرح جشن منایا یہ تفصیل الطاف گوہر کی کتاب میں محفوظ ہے کہ بہ حیثیت سیکرٹری اطلاعات وہ وہاں موجود تھے۔ یارو! یہ کبھی نہیں ہوا کہ حکمران کی عیاشی، بے بصیرتی اور ناکامیوں کی سزا قوم و ملک کو نہ ملی ہو، لیکن اس سزا کے کئی انداز ہوتے ہیں۔ دراصل یہ بحث کا مقام نہیں، سبق سیکھنے اور عبرت پکڑنے کی جگہ ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ ہمیں باکردار اور باصلاحیت قائدین سے نوازیں، یہی میری دُعا ہے۔

Marfat.com

خوف زدہ

قلم پکڑے سوچ رہا تھا کہ کیا لکھوں، تو ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میں یونیسکو کی میٹنگ میں شرکت کے لیے پیرس میں موجود تھا۔ قیام تھا چار ہفتوں کے لیے۔ یونیسکو کی رکنیت کے دوران میری یونیسکو میں ہندوستانی سفیر سے تھوڑی سی دوستی ہو گئی تھی اور شاید اس دوستی کی پہلی وجہ اس کا سردار ہونا، یعنی سکھ ہونا اور دوسری وجہ اس کا پاکپتن سے تعلق تھا۔ وہ سردار صاحب آئی سی ایس تھے اور ان کا آبائی شہر پاکپتن تھا، اگرچہ سردار صاحب تقسیم ہند کے وقت بہت کمسن تھے،لیکن نہ جانے کیوں ان کی شخصیت پر پاکپتن کا گہرا اثر محسوس ہوتا تھا، وہ اکثر مجھے بابا فریدؒ کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ وہ قدرے مذہبی انسان واقع ہوئے تھے اور زندگی کی اقدار بارے صوفیانہ سوچ رکھتے تھے۔ انھیں اچھی طرح علم تھا کہ امرتسر کے گولڈن ٹمپل کی بنیاد حضرت میاں میرؒ نے رکھی تھی۔ وہ مجھے بتایا کرتے تھے کہ ان کے بزرگ بابا فریدؒ کے عقیدت مند تھے اور ہمارے گھر میں صوفیانہ کلام بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ہم الیکشن جیت کر یونیسکو کے اراکین منتخب ہوئے، تو ایگزیکٹو بورڈ کی پہلی تعارفی میٹنگ میں ہی انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کر جپھی ڈال لی۔ سردار صاحب سنگل ہڈی کے نہایت پتلے اور نفیس انسان تھے اور ان کے مذہبی رجحان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ ہر بار مجھے ننکانہ صاحب کے گوردوارہ کے لیے کچھ نہ کچھ رقم دیتے، جو میں ننکانہ صاحب جمع کروا کر رسید ان کے حوالے کر دیتا تھا۔ وہ گھریلو قسم کے انسان تھے اور سردارنی اکثر کہا کرتی تھی کہ دلی ہو یا پیرس اسے فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ اس نے تو ''رسوئی'' (کچن) میں ہی رہنا ہے۔

مجھے پیرس گئے چند ہی روز گزرے تھے۔ ایک شام میٹنگ سے فارغ ہو کر نکلا تو سردار جی

Marfat.com

میرے ساتھ ہو لیے کہ میں آج تمھارا اپارٹمنٹ دیکھ کر گھر جاؤں گا۔ صاف ستھرے اور چوڑے فٹ پاتھ پر ہم پنجابی میں گفتگو کرتے جا رہے تھے کہ اتنے میں ہُوٹر کی آواز سنائی دی۔ اول تو پیرس میں پنجابی بولنا بھی ایک عیاشی تھی، دوم ہُوٹر کی چیخ بالکل اجنبی شے تھی، کیوں کہ میں نے یورپی ممالک میں فائر بریگیڈ کے علاوہ نہ کبھی ہوٹر کی آواز سنی تھی اور نہ ہی گھنٹی بجنے کی۔ اتوار کو گرجا گھروں کی گھنٹیاں خوب بجتی تھی اور بجتی ہی رہتی تھیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہوٹر کی آواز کسی نہایت اہم شخصیت، یعنی وی آئی پی کی آمد کی خبر ہوتی ہے، گویا شاہی سواری آرہی ہے، اس لیے سڑک خالی کر دو ورنہ محافظ تمھیں گولی مار دیں گے اور اگر گولی نہ مار سکے، تو کم از کم جی بھر کے گالیاں ضرور دیں گے۔ میں یورپی ممالک میں گھومتے پھرتے اکثر سوچتا تھا کہ کیا ان کے وی آئی پی صدر، وزیراعظم، وزرا، جج صاحبان، اعلیٰ افسران وغیرہ گھروں میں ہی بند رہتے ہیں، کیوں کہ سڑکوں پر نہ کبھی ہوٹر کی چیخیں سنیں ہیں اور نہ ہی شاہی سواری کی آمد کا اعلان سنا، جب کہ ہمارے ملک میں تو اکثر سڑکوں پر وی آئی پی حضرات کی آمد و رفت سڑکوں پر اودھم برپا کیے رکھتی ہے اور مغل بادشاہوں کی آمد ''با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نگاہیں نیچی، شہنشاہ ہند تشریف لاتے ہیں'' کی یاد دلاتی ہے، چناں چہ پیرس کی وسیع سڑک پر، جب میں نے ہوٹر کی آواز سنی، تو اس خیال نے میرے قدم جکڑ لیے کہ فرانس کا صدر یا وزیراعظم آرہا ہوگا اس کی ''زیارت'' کرلی جائے۔ میں نے سردار صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انھیں روکا اور کہا کہ سردار صاحب ذرا رک جایئے فرانس کے صدر کی جھلک دیکھ لیں۔ ذرا یہ بھی تماشا دیکھتے ہیں کہ یہاں کے وی آئی پی سڑکوں سے کیسے گزرتے ہیں؟ اتنے میں ہوٹر والا سائیکل موٹر جسے فرانسیسی پولیس افسر چلا رہا تھا، ہمارے پاس سے گزر گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہوٹر کے پیچھے ایک بڑی سی گاڑی تھی اور اس کے پیچھے چند اور کاریں، لیکن ہٹو بچو کا منظر دیکھنے کو نہ ملا۔ سردار صاحب پیرس کے شناسا تھے۔ میرا کندھا دبا کر کہنے لگے ڈاکٹر صاحب لگتا ہے آپ نے پیرس میں یہ آواز پہلی بار سنی ہے۔ یہاں وی آئی پی ہوٹر کے ساتھ شان و شوکت سے نہیں گزرتے۔ آپ نے ابھی جو منظر دیکھا ہے، وہ کسی جنازے کے گزرنے کا منظر تھا۔ ہوٹر کے پیچھے بڑی گاڑی میں میت تھی اور اس کے پیچھے چند کاریں لواحقین کی تھیں۔ مجھ سے نہ رہا جاسکا۔ میں نے لاہوری انداز میں فقرہ پھینکا۔ گویا جو پروٹوکول ہمارے ملک میں وی آئی پی حضرات کو ملتا ہے وہ یہاں مرنے کے بعد مُردوں اور میتوں کو نصیب ہوتا ہے۔ سردار صاحب میری بات سن کر مسکرائے اور پھر سنجیدہ ہو کر کہا ''ڈاکٹر صاحب۔ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ ہمارے پسماندہ ممالک میں حکمران ہمہ وقت ڈرے سہمے رہتے ہیں، ان کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوتے ہیں

Marfat.com

اوران پر ہر وقت سکیورٹی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ڈاکٹر صاحب ہمہ وقت خوفزدہ رہنے والا انسان بھی چلتا پھرتا مُردہ ہی ہوتا ہے اوراس کی زندگی قیدی کے مانند قابل رحم ہوتی ہے۔ وہ سوتا ہے تو خوف زدہ، جاگتا ہے تو خوف زدہ، باہر نکلتا ہے تو خوف زدہ، بات کرتا ہے تو دہشت زدہ، اس لیے وہ اسی پروٹوکول کا مستحق ہوتا ہے، جو پیرس میں جنازوں کو دیا جاتا ہے۔ زندگی سے پیار انسانی فطرت ہے۔اسی طرح خوف خدایا خوف خالق بھی انسانی فطرت ہے، جو انسان صحیح معنوں میں اپنے رَبّ سے ڈرتا ہے اوراس پر یقین رکھتا ہے وہ دنیاوی ''خوفوں'' سے آزاد ہو جاتا ہے۔جس شخص کا تقدیر پر اندھا ایمان ہے اور اسے یقین ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے، وہ ہر لمحے نہیں مرتا۔ڈاکٹر صاحب خوف کی زندگی ہر لمحہ موت کی زندگی ہے اور یوں انسان مرنے سے پہلے مسلسل مرتا ہی رہتا ہے۔خوف سے آزاد انسان ہر لمحہ جیتا اور زندگی کو بھر پور انداز سے انجوائے کرتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اپنی حفاظت کا انتظام نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بہ ہر حال نہایت ضروری ہے، لیکن اپنی زندگی کو حفاظت کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا اس اندرونی خوف کی علامت ہے، جو زندہ انسانوں کو مردہ بنا دیتا ہے''۔فٹ پاتھ پہ چلتے چلتے سردار صاحب رُک گئے اور میرے چہرے پر نظریں جما کر کہنے لگے''ڈاکٹر صاحب میں خوف کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔میرے مخاطب صرف حکمران ہی نہیں۔ میں نے اپنی انتظامی ذمہ داریوں کے دوران پھانسی کی کال کوٹھڑی میں بے خوف قیدیوں کو دیکھا ہے، جو اندر باہر سے زندہ تھے اور ایسے خوف زدہ قیدیوں کو بھی سانس لیتے دیکھا ہے، جو پھانسی چڑھنے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ بے خوف اور نڈر ہونا زندگی کی علامت ہے اور خوف کے پہاڑ تلے دبے رہنا موت کی علامت ہے، چاہے انسان طبعی حوالے سے زندہ ہی کیوں نہ ہو۔

خوف پاؤں کی زنجیر اور راستے کی دیوار ہوتا ہے، اگر خوف ہوتا تو آپ کے نبی کریمؐ بے سروسامانی کے خوف سے کبھی کفار کے خلاف میدان جنگ میں نہ اُترتے اور نہ ہی حضرت حسینؓ اپنے معصوم بچوں کو ساتھ لے کر سُوئے کربلا روانہ ہوتے۔ڈاکٹر صاحب! زندگی بھی عجیب شے ہے، کچھ لوگ مر کر زندہ رہتے ہیں اور کچھ لوگ زندہ رہتے ہوئے مرجاتے ہیں۔بس یہی بات سمجھنے اور غور کرنے کی ہے۔

Marfat.com

قدرت کے اِنعامات اور ہماری نااہلی

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ قدرت پاکستان پر کتنی مہربان ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ہم پر کتنا کرم ہے۔ ہم اُس کی اَن گنت نعمتوں کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتے، لیکن اس فضل و کرم کے باوجود ہم نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ ان نعمتوں سے عام شہریوں کو فائدہ نہیں پہنچنے دیں گے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی سیکڑوں نعمتوں اور انعامات کے باوجود ہم اپنی حالت نہیں بدلیں گے۔ پہلے ذرا قدرت کی نعمتوں اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کے پاکستان پر انعامات کا جائزہ لیں تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ رب العالمین پاکستان پر کتنا مہربان ہے۔ پاکستان عالمی سطح پر سونے کے ذخائر کے حوالے سے پانچواں بڑا ملک ہے اور ہماری ان کانوں میں سیکڑوں ارب ڈالروں کا سونا موجود ہے۔ ہمارے پاس کوئلے کے پانچویں بڑے اور تانبے کے ساتویں بڑے ذخائر موجود ہیں۔ اللہ پاک نے پاکستان کو دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کانیں عطا کی ہیں۔ ہمارے پاس دنیا کا دوسرا بڑا ڈیم ہے پانچ دریا ہیں جو کم ملکوں کو نصیب ہوئے ہیں۔ کرۂ ارض پر دوسوانچاس ممالک ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باوجود پاکستان رقبے کے لحاظ سے چونتیسواں اور آبادی کے حوالے سے چھٹا بڑا ملک ہے۔ اس وقت پاکستان سمیت صرف پینتیس ملکوں کے پاس گلیشیر کی صورت میں پانی کے محفوظ ذخائر موجود ہیں، جب کہ پاکستان کو قدرت نے دس گلیشیروں میں سے ایک بڑے گلیشیر سے نوازا ہے۔ دنیا میں بیالیس ممالک ایسے ہیں، جو ساحل سے محروم ہیں، جب کہ پاکستان کے پاس تقریباً سوا آٹھ سو کلومیٹر کا سمندری ساحل موجود ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق دنیا کے سترہ ممالک دریا سے محروم ہیں، جب کہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے پانچ دریا عطا کیے ہیں اور ان میں دریائے سندھ دنیا کا بائیسواں طویل دریا سمجھا جاتا ہے۔ قدرت نے پاکستان کو اڑتالیس قدرتی اور آٹھ غیر قدرتی جھیلیں عطا

Marfat.com

کی ہیں اور دنیا کا سب سے بڑا مصنوعی آبپاشی کا نہری نظام پاکستان کو دیا ہے۔ دنیا کے بائیس ممالک پہاڑوں سے محروم ہیں، جب کہ پاکستان کے حصے میں دنیا کی دوسری بڑی چوٹی (کے ٹو) کے ساتھ ساتھ دنیا کے دس عظیم پہاڑی سلسلوں میں سے تین عظیم پہاڑی سلسلے بھی آئے ہیں۔ یورپی ممالک صحراؤں سے محروم ہیں، جب کہ پاکستان کو دنیا کا بیسواں بڑا صحرا ملا ہے۔ پاکستان کو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس قدر زرخیز مٹی دی ہے کہ سونا اگلتی اور دھرتی پر چلنے والوں کی خوراک کا نہایت آسانی سے بوجھ اٹھا سکتی ہے۔ کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے دو سو انچاس ممالک میں سے پاکستان گنے کی پیداوار میں پانچواں اور چینی کی برآمد میں نواں بڑا ملک ہے۔ گندم کی پیداوار میں پاکستان آٹھویں نمبر پر ہے اور چاول کی برآمد کے حوالے سے تیسرے نمبر پر ہے۔ پیاز کی پیداوار کے حساب سے پاکستان چوتھے نمبر پر ہے اور چنے کی پیداوار میں دوسرے نمبر پر ہے۔ آم کی پیداوار کے لیے پاکستان عالمی سطح پر چوتھے نمبر پر ہے، کھجور کی پیداوار میں چھٹے نمبر پر ہے اور دودھ کے حوالے سے پاکستان دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے۔ بکریوں کی تعداد کے حوالے سے پاکستان تیسرا بڑا ملک ہے اور اونٹوں کی تعداد میں چھٹا بڑا ملک ہے۔ گوشت برآمد کرنے والے ممالک میں پاکستان کا نمبر بارہ ہے۔

تفصیل میں جاؤں تو آپ اعداد و شمار سے بیزار ہو جائیں گے۔ اس مختصری تصویر دکھانے کا مطلب آپ کو صرف یہ سمجھانا تھا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے دو سو انچاس ممالک میں سے پاکستان کو ایسی نعمتوں سے نوازا ہے اور پاکستان پر اپنے انعامات کی اس قدر بارش کی ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی، اگر کوئی اور ملک قدرتی نعمتوں کے ایک شعبے میں ہم سے آگے ہے، تو ہم دوسری نعمتوں میں اُس سے بہت آگے ہیں۔ ان تمام نعمتوں میں ایک اعلیٰ ترین نعمت یہ ہے کہ پاکستانی محنتی اور جفاکش لوگ ہیں۔ پاکستان ایٹمی قوت ہے اور پاکستان کی فوج دنیا کی بہترین افواج میں شمار ہوتی ہے۔ امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ ہماری فوج کو صرف بائنڈنگ فورس (اتحاد قائم رکھنے والی قوت) قرار دیتے ہیں، جب کہ میں اپنی فوج کو پاکستان کے جسم میں طاقت و روح سمجھتا ہوں۔ ہمارا کسان دنیا کے محنتی ترین کسانوں میں شامل ہے اور ہماری افرادی قوت جب غیر ممالک میں جاتی ہے تو پاکستان کو بارہ تیرہ ارب ڈالر سالانہ بھجوای ہے۔ یقین رکھیے، اگر اس افرادی قوت کو ملک کے اندر استعمال کرنے کے مواقع پیدا اور مہیا کیے جائیں تو یہ تین گناہ زرمبادلہ، یعنی تیس ارب ڈالر کما سکتی ہے۔ افرادی قوت کا ذکر ہو تو یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ پاکستان نے دنیا کے بہترین ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، بینکار، لکھاری وغیرہ وغیرہ پیدا کیے ہیں، صرف

Marfat.com

حکمرانوں کے شعبے میں مار کھا گیا ہے۔ پاکستان کے بانی قائداعظم کا شمار عالمی سطح کے عظیم لیڈروں میں ہوتا ہے اور امریکی مورخ سٹینلے والپرٹ تو انھیں عالمی تاریخ کا واحد لیڈر قرار دیتا ہے، جس نے بہ یک وقت تین تاریخی کارنامے سرانجام دیے۔ ہماری بدقسمتی کہ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

پاکستان پر قدرت کے انعامات کی جھلک دیکھنے کے بعد آپ سوچیں گے کہ ان تمام کی موجودگی میں ہم پسماندہ اور غریب کیوں ہیں؟ ہمارے پاس تین نیوکلیئر ری ایکٹر اور پانچ دریاؤں کے علاوہ پہاڑی علاقوں میں بے شمار ایسی ندیاں موجود ہیں، جن سے بے پناہ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے لیکن ہم لوڈشیڈنگ کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں، ہماری صنعتیں دم توڑ رہی ہیں اور ہم دنیا کا بہترین کپڑا بناتے بناتے اب ٹیکسٹائل کے شعبے میں بھی تنزل اور بحران کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ پاکستان گندم کی پیداوار کے حساب سے دنیا کا آٹھواں بڑا ملک ہے اور ہم ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد فالتو گندم برآمد کرتے ہیں، لیکن پاکستان میں لوگ بھوک، کم خوراک اور فاقہ کشی سے مر رہے ہیں، سندھ کے علاقے تھر میں بھوک کا راج ہے اور انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہم گندم اور چینی برآمد کرتے ہیں، لیکن پاکستانیوں کو دونوں چیزیں مقابلتاً مہنگے داموں بیچتے ہیں۔ ہمارے گودام غلے سے بھرے ہوئے ہیں، لیکن عام لوگوں کے پاس خریدنے کی سکت نہیں ہے۔ ان تمام خدائی نعمتوں کے باوجود ہماری فی کس آمدنی بہت کم ہے، جب کہ ملکی دولت پر گنے چنے چند خاندان قابض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پٹرول، تیل اور گیس کے وافر خزانے دیے ہیں لیکن ہم میں انھیں پوری طرح دریافت اور استعمال کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم ٹیکنالوجی میں پیچھے ہیں، اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ ہم منصوبہ بندی اور حکمرانوں کی کرپشن، نااہلی اور عدم سیاسی استحکام کی وجہ سے مار کھا رہے ہیں۔

اس ساری رام کہانی کا نتیجہ یہ ''اصلی'' سوال ہے کہ قدرت کی عطا کردہ ان نعمتوں کے باوجود ہم غریب کیوں ہیں؟ میں جب ان حقائق کو دیکھتا اور پڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ قدرت ہم پر بے حد مہربان ہے، ہم دنیا کے چند خوش قسمت ترین ممالک میں سے ہیں، قدرت کا منشا پاکستان میں خوشحالی ہے، تو پھر ہم مفلسی کی تصویر کیوں ہیں، عالمی رائے عامہ ہمیں بھکاری کیوں سمجھتی ہے؟ میں اپنے طور پر ان سوالات کا جواب ڈھونڈتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ صورت حال نہایت پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے، اگر صرف بنیادی عوامل کا سطحی مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بھوک، افلاس اور پسماندگی ہمارا ہرگز مقدر نہیں ہے، بل کہ ہم خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ تجزیے اور تفصیل میں گئے بغیر چند بنیادی عوامل کا ذکر ضروری ہے،

Marfat.com

جنہیں میں اپنی قومی پسماندگی اور غربت کا سبب جانتا ہوں۔

(1) حکمرانوں کی لوٹ مار، کرپشن، عیاشی، بصیرت کا فقدان، غلط ترجیحات اور صحیح منصوبہ بندی کا قحط، کرپشن کا یہ عالم ہے کہ اس وقت سوئٹزر لینڈ کے بینکوں میں پاکستان سے لوٹی گئی دولت کے دوسو ارب ڈالر پڑے ہیں، وعدوں کے باوجود حکمران رقم واپس نہیں لا سکے۔ جب کہ ملک میں قرضوں تلے دبا ہوا ہے اور ہم تیرہ ارب ڈالرز زرمبادلہ کے ذخائر پر خوشیاں منا رہے ہیں۔ ان دوسو ارب ڈالروں سے ملک کی معاشی قسمت بدل سکتی ہے۔

(2) ہماری غربت کا دوسرا بڑا سبب کرپشن اور لوٹ مار ہے، جس کے سدباب کا کوئی علاج موجود نہیں، ملکی دولت لوٹ کر بیرون ملک بھیجی جا رہی ہے۔

(3) تعلیم، ٹیکنالوجی حکومت کی اولین ترجیح کبھی نہیں رہی۔ گزشتہ تین دہائیوں میں ہم تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ تعلیم ٹیکنالوجی سائنس بہترین سرمایہ کاری اور غربت کا مؤثر علاج ہے، لیکن ہمارے حکمرانوں پر یہ راز ابھی تک نہیں کھلا۔

(4) دہشت گردی اور داخلی عدم استحکام بھی ہماری پسماندگی کی بڑی وجہ ہے۔

(5) قدرت نے ہمیں قدرتی وسائل کی صورت میں جو نعمتیں دی ہیں، ہم ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔

(6) ہماری قیادت کی نالائقی اور بے بصیرتی کا نتیجہ لوڈ شیڈنگ ہے، اگر بروقت منصوبہ بندی کر کے بجلی پیدا کر لی جاتی تو آج قوم اندھیروں نہ ڈوبی ہوتی، نہ ہمارے صنعت کار اور سرمایہ کار ملک سے باہر سرمایہ منتقل کرتے اور نہ ہی صنعتی ترقی کا عمل رُکتا۔ دہشت گردی اور لوڈ شیڈنگ نے ہی بیرونی سرمایہ کاروں کا راستہ روکا ہے۔

یہ موضوع طویل ہے، لیکن میرے نزدیک قدرت کی نعمتوں کے باوجود ہماری غربت کی بنیادی وجہ قومی و حکومتی سطح پر منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ سنگاپور، جاپان، کوریا، ملائیشیا اور کئی یورپی ممالک قدرت کی ان نعمتوں کی قلت کے باوجود صرف قیادت کی بصیرت اور صحیح منصوبہ بندی کی وجہ سے معاشی، صنعتی اور تعلیمی ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں، جب کہ ہم قدرت کے انعامات کے باوجود غربت کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ سوچئے اور غور کیجئے۔

Marfat.com

مبارک باد...... کس کو؟

خوشی کے موقع پر خوشی ہی منانی چاہیے کہ خوشیوں کی پیاسی پاکستانی قوم کو خوشخبریاں کم اور ''بدخبریاں'' زیادہ ملتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ چینوٹ اور رجوعہ کے علاقے میں تانبے سونا وغیرہ کے خزانوں کی خبر سن کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ یہ درست کہ ان معدنی خزانوں کو عملی شکل دینے کے لیے عرصہ درکار ہوتا ہے، لیکن ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم صرف اچھی خبر سن کر ہی خوش ہو جاتے ہیں اور مستقبل کے لیے سہانے خواب بننے لگتے ہیں۔ چلیے ہمیں نہ سہی، ہماری آیندہ نسلوں کو ہی خوشحالی نصیب ہو جائے اور ملک غربت کے چنگل سے نکل جائے تو اسے اللہ کا فضل وکرم سمجھیے۔ یہ خوشخبری سن کر مجھے قائداعظمؒ بہت یاد آئے، جو قیام پاکستان کے بعد یہ فرماتے رہے کہ قدرت نے پاکستان کو معدنی وقدرتی وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے اور وہ دن دُور نہیں جب یہاں خوشحالی کا سورج طلوع ہو گا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ بابائے قوم نے زمین کے اندر چھپے ہوئے معدنی خزانے، لوہے، تانبے، کوئلے چاندی اور سونے کی کانیں تو دیکھ لی تھیں، لیکن وہ زمین کے اوپر چلتے ہوئے سیاسی وسائل کو نہ دیکھ سکے۔ یقیناً وہ ملک کے سیاسی وسائل کے بارے میں زیادہ خوش فہم نہیں تھے، اگرچہ قائداعظم کے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان میں ایک سے ایک بڑھ کر ایماندار، اہل، مخلص اور ملک وقوم کی بے پناہ محبت کا اسیر تھا، لیکن پھر ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ قائداعظم کی پیشین گوئی کے مطابق پاکستان میں قدرتی معدنی وسائل تو دریافت ہو رہے ہیں اور ہم ان پر فخر بھی کرتے ہیں، لیکن اول تو قائداعظم کی خواہش کے مطابق ابھی تک ان قدرتی وسائل سے قوم کو من حیث القوم فائدہ نہیں پہنچا، خوشحالی ابھی تک محض ایک خواب ہی ہے اور دوم قائداعظم کو آیندہ نسلوں سے جو توقعات تھیں وہ بھی پوری نہیں ہوئیں۔ بلاشبہ ہم نے سائنس، صحت اور تعلیم

Marfat.com

کے میدانوں میں ترقی کی ہے، ایٹمی قوت بھی بن چکے ہیں اور ہمارے نوجوان دنیا بھر میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں، ہمارے طلبا عالمی سطح کے امتحانات میں اول دوئم پوزیشنیں لے کر ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت دے رہے ہیں، لیکن قائداعظم کی آرزو کے مطابق ہماری نسلیں پاکستان کو اہل، دیانت دار اور بصیرت افروز قیادت مہیا نہیں کر سکیں۔ قائداعظم پاکستان سے کرپشن، سفارش، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، اقربا پروری، جہالت، فضول خرچی، صوبائیت اور فرقہ واریت وغیرہ وغیرہ کا خاتمہ چاہتے تھے اور بار بار اپنی تقاریر میں عوام کی توجہ اس طرف دلاتے تھے اور وہ جب تک زندہ رہے اس کی عملی مثالیں بھی قائم کرتے رہے، لیکن گزشتہ پچاس برسوں کے دوران یہ تمام بیماریاں ہمارے قومی جسم کے اندر نہ صرف سرایت کر چکی ہیں، بل کہ ہماری قومی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ نئی نسلوں سے جنم لینے والی قیادت بھی ان امراض کو پھیلانے میں نہ صرف مصروف رہی ہے، بل کہ اکثر اوقات اپنے مفادات کے لیے ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔ ہماری بدقسمتی کہ گزشتہ چند برسوں سے اس میں دہشت گردی کا بھی اضافہ ہو چکا ہے، جس نے رہی سہی کسر نکال دی ہے، لیکن اس سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ایسی قیادت دُور دُور تک نظر نہیں آتی، جو قوم کو ان امراض سے نجات دلا سکے۔ کیا گزشتہ کئی برسوں سے ہم نہیں دیکھ رہے کہ لوٹ مار کا بازار گرم ہے، قومی دولت لوٹ کر بیرون ملک بھجوائی جا رہی ہے۔ حکمران طبقے اور اشرافیہ کروڑ پتی سے ارب پتی اور ارب پتی سے کھرب پتی بن چکے ہیں، لیکن عوام کی غربت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل پاکستان کی ایک تہائی آبادی خط غربت سے نیچے سسک رہی تھی، آج پچاس فیصد آبادی غربت کے بوجھ تلے تڑپ رہی ہے۔ ان قائدین میں نہ ان مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت ہے، نہ حل کرنے کی بصیرت اور یہی وہ وجہ ہے، جس کے سبب تمام تر قدرتی وسائل اور معدنی خزانوں کے باوجود ملک نہ صرف اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے، بل کہ رفتہ رفتہ غربت کے شکنجے میں بھی پھنستا جا رہا ہے۔

خوشی کے موقع پر خوش ہی ہونا چاہیے، لیکن کیا کیجیے کہ ہمیں ہمارا ماضی کا تجربہ خوش بھی نہیں ہونے دیتا۔ چند برس قبل یہ خوشخبری سنائی گئی تھی کہ تھر میں دریافت ہونے والے کوئلے کے ذخائر دنیا کے پانچویں بڑے ذخائر ہیں۔ سائنس دان ڈاکٹر ثمر مند مبارک مسلسل یہ خوشخبری سناتے رہے کہ تھر کول سے پچاس ہزار میگا واٹ بجلی، ایک ارب بیرل ڈیزل دستیاب ہوگا اور بجلی کی قیمت 5-4 روپے فی یونٹ ہوگی۔ یہ بتا کر بھی ہمارے حوصلے بڑھائے گئے کہ یہ ذخائر پانچ سو سال کے لیے کافی ہیں۔ ڈاکٹر ثمر مند نے شعلہ جلا کر 2015ء میں تھر کول سے سستی بجلی پیدا کرنے کی بھی خوشخبری سنائی تھی، پھر جن کمپنیوں کو تھر کول میں

Marfat.com

ٹھیکے دینے کی خبریں آئیں، ان سے کمیشن کے جھگڑوں کی بھی خبریں آنے لگیں۔ آج یہ خوشخبریاں دیوانے کا خواب بن چکی ہیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ پاکستان سونے کے ذخائر کے حوالے سے پانچواں بڑا ملک ہے۔ ریکوڈک کے حوالے سے جو خوشخبریاں سنائی گئیں، اگر ان کی ایک چوتھائی کو بھی حقیقت کا روپ دیا جاتا، تو آج ہم کشکول اُٹھائے عالمی سطح پر بھکاری کی پہچان سے آزاد ہو چکے ہوتے۔ کس قدر تکلیف دہ ہے یہ حقیقت کہ رقبے کے حساب سے چونتیسواں اور آبادی کے حوالے سے چھٹا بڑا ملک پاکستان ایٹمی قوت ہونے کے باوجود قرضوں کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اور غربت کی نئی منزلیں طے کر رہا ہے۔ سچ جانو کے اس حال تک پہنچنے میں اشرافیہ اور حکمران طبقوں کی لوٹ مار اور نا اہلی نے سب سے زیادہ رول سرانجام دیا ہے۔

میرا بھی جی چاہتا ہے کہ چنیوٹ میں قیمتی ترین قدرتی وسائل کی دریافت پر ڈھول بجاؤں اور حکمرانوں کے وعدوں کو آنکھوں میں سجاؤں، لیکن کیا کروں کہ اب ان وعدوں پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا۔ کہا گیا تھا کہ ہم سوئٹزرلینڈ میں پاکستانیوں کے چھپائے ہوئے ایک سوارب ڈالر واپس لائیں گے، صدر زرداری صاحب کے سوئٹزرلینڈ میں چھپائے گئے 6 کروڑ ڈالر قوم کو واپس کریں گے، تھرکول سے سستی بجلی پیدا کریں گے، ریکوڈک کے سونے چاندی سے خوشحالی کا انقلاب لائیں گے۔ کیا دو سال میں کوئی پیش رفت ہوئی؟ آپ ہی بتایئے، میں ان حالات میں چنیوٹ کے ذخائر پر عوام کو مبارک باد دوں یا حکمران طبقوں کو؟

Marfat.com

پاکستان کیوں ٹوٹا؟ ایک بنیادی حقیقت یاد رکھیں

ایک بنیادی سوال ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سانحے کا ''ڈائریکٹر'' کون تھا؟ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کس کی سرپرستی، مدد اور مداخلت سے عمل میں آئی؟ اس کا ہرگز مطلب اپنی سیاسی غلطیوں، کوتاہیوں، مختلف حکومتوں، حکمرانوں اور فوجی راج کے پیدا کردہ احساس محرومی پر پردہ ڈالنا نہیں، کیوں کہ وہ سب کچھ بہ ہرحال تلخ حقیقتیں ہیں اور انھیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسی سے دوسرا سوال جنم لیتا ہے کہ کیا اس قسم کی محرومیاں، کوتاہیاں، غیر دانش مندانہ پالیسیاں اور بے انصافیاں صرف پاکستان میں ہی روا رکھی گئیں؟ کیا صوبائی کشمکش، علاقائی آزادی کی تحریکیں اور نفرتیں صرف پاکستان کی سیاست کا ہی حصہ تھیں؟ نہیں ہرگز نہیں اسی طرح کی صورت حال بہت سے نو آزاد یا ترقی پذیر ممالک کے علاوہ بعض ترقی یافتہ ممالک کے صوبوں میں رسہ کشی اور نفرت بھی رنگ دکھاتی ہے، بعض اوقات حکمران اور حکومتیں غلط فیصلے بھی کرتی ہیں، لیکن ان تمام عوامل کے باوجود ممالک اندرونی طور پر تقسیم ہونے کے باوجود ٹوٹتے نہیں۔ ان کے کچھ علاقے یا صوبے آزادی کا نعرہ بھی لگاتے ہیں، علیحدگی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں، جیسا کہ خود ہندوستان میں کوئی درجن بھر علیحدگی کی تحریکیں جاری و ساری ہیں، لیکن کبھی یہ نہیں ہوا کہ کسی علاقے کو فوجی قوت کی بنا پر الگ ہونے کی اجازت دی جائے۔ بہ شمول مقبوضہ کشمیر ہندوستان کے کئی صوبوں میں علیحدگی پسندی اور آزادی کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ گوریلا جنگ بھی جاری ہے، حکومت کی بعض علاقوں میں رٹ بھی موجود نہیں، لیکن اس کے باوجود وہاں کوئی صوبہ یا علاقہ نہ ہندوستان سے علیحدہ ہوا ہے اور نہ ہی آزاد۔ سکھوں نے آزادی کی تحریک چلائی، تو ہندوستان نے اسے کچل کر رکھ دیا مقبوضہ کشمیر میں مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، پھر پاکستان ہی کو کیوں اس قیامت صغریٰ سے گزرنا پڑا؟

Marfat.com

ایک بار پھر میں یہ بانگ دہل تسلیم کرتا ہوں کہ مشرقی پاکستان سے بے انصافیاں ہوئیں، ان کا معاشی حصہ انھیں اس قدر نہ ملا، جس قدر ان کا حق تھا۔ مشرقی پاکستان آبادی میں 56 فیصد تھا، اس لیے جمہوری اصولوں کی روشنی میں پیرٹی یا برابری بھی ان کے ساتھ زیادتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے وہ دانش ور جو آئین میں پیرٹی پر احتجاج کرتے اور اسے ہمالہ جیسی غلطی قرار دیتے ہیں، جذبات کی رو میں بہہ کر یہ بھول جاتے ہیں کہ جغرافیائی فاصلے کو حقیقت تسلیم کرتے ہوئے برابری یا پیرٹی کا اصول سب سے پہلے بنگالی وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کے آئینی فارمولے میں آیا تھا، جس کی بنیاد پر 1954ء میں دستور بنایا جانا تھا، لیکن غلام محمد نے اسمبلی برخاست کر کے دستور سازی کی بساط لپیٹ دی۔ اس سے قبل خواجہ ناظم الدین فارمولے میں بھی برابری کا مقصد ایک اور طریقے سے حاصل کیا گیا تھا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آئین میں برابری کا اصول بنگالی سیاست دانوں نے خوش دلی سے تسلیم کیا تھا۔ گزشتہ برسوں کے دوران 16 دسمبر کے حوالے سے ٹی وی پروگراموں میں 1956ء کے آئین میں طے کردہ پیرٹی کے اصول کو خوب رگڑا دیا گیا۔ رگڑا دینے والوں کو علم نہیں تھا کہ 1956ء کا آئین جناب حسین شہید سہروردی کا کارنامہ تھا اور وہ نہ ہی صرف بنگالی تھے، بل کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے استاد، سیاسی رہنما اور گرو بھی تھے۔ دراصل اب یہ ساری باتیں خیال رفتہ (After thought) ہیں، اگر مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہ بنتا، تو پھر یہ باتیں کسی کو یاد بھی نہ ہوتیں اور نہ ہی موضوع گفتگو ہوتیں۔ مارچ 1948ء میں مشرقی پاکستان کے دورے کے دوران قائداعظمؒ کے اس بیان پر بھی تنقید کی جاتی ہے کہ صرف اُردو قومی زبان ہوگی، آپ بنگالی کو صوبائی سطح پر سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کر لیں۔ تنقید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اس سے قبل 25 فروری 1948ء کے دن اُردو کو سرکاری قومی زبان قرار دے چکی تھی، جس کی بنگالیوں نے اسمبلی میں حمایت کی تھی۔ قائداعظم نے تو اسمبلی کے فیصلے کی نمایندگی کی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی احساس محرومی کو ایوبی مارشل لا اور فوجی طرز حکومت نے اُبھارا اور اسے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل دی۔ پارلیمانی جمہوریت میں بنگالیوں کو اقتدار ملنے کی توقع تھی، وہ جانتے تھے کہ کسی بھی چھوٹے صوبے کو ساتھ ملا کر پیرٹی کے باوجود وہ اقتدار حاصل کر سکیں گے، لیکن ایوبی مارشل لا نے ان کی امید کی یہ شمع بھی بجھا دی اور انھیں یقین دلا دیا کہ اب کبھی ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا، پھر ایوبی مارشل لا کی آمرانہ سختیوں، میڈیا، سوچ اور اظہار پر شدید پابندیوں اور سیاسی مخالفوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی کارروائیوں نے بنگالیوں پر یہ بھی واضح کر دیا کہ

Marfat.com

ان کا سیاسی مستقبل تاریک ہے۔''پاکستان سے بنگلہ دیش'' نامی کتاب میں سابق بنگالی سفیر اور کرنل شریف الحق نے بالکل درست لکھا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے 1969ء میں علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کرنل شریف الحق بنگلہ دیش کی تحریک آزادی اور 1971ء کی جنگ کے ہیرو ہیں۔ وہ بنگلہ دیش کے سابق سفیر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں شامل تھے، چناں چہ ان کا لکھا ہوا مستند ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن جب 1972ء میں رہائی پا کر لندن پہنچا تو اس نے بی بی سی کے انٹرویو میں یہ تسلیم کیا کہ وہ عرصے سے بنگلہ دیش کے قیام کے لیے کام کر رہا تھا۔ 16 نومبر 2009ء کو بنگلہ دیش کی وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی حسینہ واجد نے انکشاف کیا کہ وہ 1969ء میں لندن میں اپنے والد کے ساتھ تھی، جہاں شیخ مجیب الرحمٰن نے ہندوستانی ایجنسی ''را'' کے افسران سے ملاقاتیں کیں اور بنگلہ دیش کے قیام کی حکمت عملی طے کی۔ حسینہ واجد کا بیان عینی شاہد کا بیان ہے۔ اس پر تبصرے کی ضرورت نہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کبھی بھی اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہوتا، اگر اسے ہندوستان کی مکمل حمایت حاصل نہ ہوتی اور ہندوستان اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر مشرقی پاکستان کو الگ نہ کر دیتا۔ اس اُلجھی ہوئی کہانی کو سمجھنے کے لیے اس پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ جب 1956ء کے آئین میں بنگالی لیڈر شپ نے پیرٹی کا اصول مان لیا تھا تو پھر یحییٰ خان نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی اس اصول کو کیوں ختم کر دیا اور کس اتھارٹی کے تحت ون یونٹ ختم کرنے اور ون مین ون ووٹ کا اصول نافذ کرنے کا اعلان کیا، کیوں کہ یہ فیصلے تو نئی دستور ساز اسمبلی نے کرنے تھے۔ دراصل یحییٰ خان صدارت پکی کرنے کے لیے مجیب الرحمٰن سے ساز باز کرنے میں مصروف تھا اور یہ وہ بنیادی فیصلے اسی ہوسِ اقتدار کے تحت کیے گئے تھے۔ یہ بات بھی سو فیصد درست ہے کہ انتخابات کروانے کے بعد اقتدار منتقل نہ کرنا پاکستان کو توڑنے کے مترادف تھا، ورنہ بنگالی ہرگز علیحدگی نہیں چاہتے تھے۔ سیاسی بصیرت اور ملکی اتحاد کا تقاضا تھا کہ اقتدار اکثریتی پارٹی کو منتقل کیا جاتا۔ اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کے نتیجے کے طور پر مشرقی پاکستان میں بغاوت ہوئی، جسے کچلنے کے لیے آرمی ایکشن کیا گیا۔ گولی سیاسی مسائل کا کبھی حل نہیں ہوتی، چاہے وہ مشرقی پاکستان ہو یا بلوچستان۔ سیاسی مسائل ہمیشہ سیاسی بصیرت سے ہی حل ہوتے ہیں۔ آرمی ایکشن نے بہ ظاہر پاکستان کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ 16 دسمبر کے سانحے کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم ایک بنیادی پہلو اور اہم ترین فیکٹر کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ وہ بنیادی حقیقت ہے، بھارت کی ہمسائیگی اور بھارت کے ساتھ دو تہائی بارڈر کا مشترک ہونا۔

فرض کیجیے کہ مشرقی پاکستان بھارت کا ہمسایہ نہ ہوتا تو کیا بنگالی برادران کو کہیں سے اتنی مالی،

Marfat.com

فوجی اور سیاسی بد دلتی، اگر وہ بڑی تعداد میں ہجرت بھی کر جاتے تو کیا دوسرا ہمسایہ ملک انھیں وہاں جلا وطن حکومت قائم کرنے دیتا، ان کے نوجوانوں کو مکتی باہنی بنا کر رات دن فوجی تربیت اور اسلحے سے لیس کر کے گوریلا کارروائیاں کرنے کی اجازت دیتا، آرمی ایکشن کی زیادتیوں کو نہایت طاقت ور میڈیا کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلاتا اور پاکستان کی جی بھر کے کردار کشی کرتا، روس جیسی سپر پاور کو اندرونی معاملے میں شامل کرتا اور روس سے معاہدہ کر کے اور بے پناہ فوجی اسلحہ لے کر اپنے ہمسایہ ملک پر چڑھ دوڑتا، اگر یہ مکتی باہنی کی فتح تھی تو پھر پاکستان کی فوج نے ہندوستان کے سامنے ہتھیار کیوں ڈالے؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ہندوستان کا کیا دھرا تھا، ہندوستان نے بنگالیوں اور مکتی باہنی کی آڑ میں تقسیم ہند اور 1965ء کی جنگ کا انتقام لیا۔ ورنہ آرمی ایکشن سری لنکا میں بھی ہوتے رہے، ہندوستان میں بھی سکھوں کا قتل عام ہوا، مقبوضہ کشمیر میں بھی خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ کیا یہ علاقے اپنے ملکوں سے الگ ہوئے؟ اسی سیاسی و تاریخی پس منظر میں 16 دسمبر 1971ء کو اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ہم نے ہندوستان ماتا کی تقسیم کا بدلہ لے لیا اور نظریہ پاکستان کو خلیج بنگال میں ڈبو دیا۔ بلاشبہ غلطیاں، زیادتیاں اور بے انصافیاں ہوئیں، لیکن اس طرح کی غلطیاں اور بے انصافیاں بہت سے ممالک میں ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں، لیکن ان کے استحکام پر زد نہیں پڑی، نہ ہی پڑوسی ان غلطیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ دراصل ہمارے اس سانحے کا ڈائریکٹر ہندوستان تھا اور یاد رکھیے اسے آیندہ بھی موقع ملا تو باز نہیں آئے گا۔ یہ بھی یقین رکھیے میں نے یہ الفاظ کسی نفرت کے جذبے کے تحت نہیں لکھے، بل کہ میرے ان احساسات و خدشات کے سوتے ملک کی محبت سے پھوٹتے ہیں۔ میں ہمسایہ ممالک بہ شمول ہندوستان سے اچھے دوستانہ روابط قائم کرنے کے حق میں ہوں۔ جنگیں ہرگز مسائل کا حل نہیں ہوتیں۔ امن ہماری ضرورت ہے مضبوط دفاع ہماری بقا کا ضامن ہے، لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ تاریخ کو بھلا دیا جائے۔ میری بات ذہن نشین کر لیجیے جو قومیں اپنی تاریخ فراموش کر دیتی ہیں، ان کا جغرافیہ انھیں فراموش کر دیتا ہے۔

Marfat.com

دسمبر 1971ء کے زخموں سے خون رِستا رہے گا......!!

سلطان رضا صاحب بنگلہ دیش کے متمول تاجر ہیں اور اب امریکا کی شہریت لے کر واشنگٹن کے قریب ورجینیا میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ نہایت روانی سے اُردو بولتے اور بہت اچھی انگریزی لکھتے ہیں۔ رضا صاحب 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکا میں تھے اور اس حوالے سے وہ ہمارے یوم سیاہ کے عینی شاہد ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے اس موضوع پر انگریزی میں طویل مضمون لکھا، جو قابل مطالعہ اور چشم کشا ہے۔ مولوی فرید احمد پیدائشی بنگالی اور کٹر پاکستانی تھے، چناں چہ انھوں نے پاکستان کو متحد رکھنے کے لیے دن رات کوششیں کیں اور اس جرم کی سزا کے طور پر انھیں شہید کر دیا گیا۔ سلطان رضا اس طرح کے سانحات پر دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ 16 دسمبر 71ء کے دن ڈھاکا میں سلطان ٹیپو روڈ سے گزر رہا تھا کہ اس نے عیسائی قبرستان کے قریب تین نوجوانوں کو دیکھا، جن کے ہاتھوں میں خطرناک رائفلیں تھیں، ان کے پیچھے بنگالیوں کا ہجوم تھا۔ یہ سب لوگ جے بنگلہ کے نعرے لگاتے ہوئی فائر کرتے اور آزادی کا جشن مناتے 6 نہتے نوجوانوں کا تعاقب کر رہے تھے، جو اپنی جانیں بچانے کے لیے خدا کی زمین پر پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ان 6 نوجوانوں میں چار بنگالی اور دو نان بنگالی، یعنی بہاری تھے۔ بالآخر اس ہجوم نے ان کو جالیا اور گولیوں سے بھون کر جشن منایا۔ شہید ہونے والوں پر پاکستانی فوج کی مدد کا الزام تھا۔ شاید ان کا تعلق الہدر اور الشمس سے تھا۔ اس ہجوم میں وہ لوگ بھی شامل تھے، جن کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ زیادتیاں کی گئی تھیں اور وہ انتقام کی آگ بجھانے کے لیے پاگل ہو رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ پاکستانی فوجیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، لیکن پاکستانی فوج ہندوستانی فوج کی پناہ میں تھی، جس کے سامنے اس نے ہتھیار ڈالے تھے۔ سلطان رضا اپنے ایک دیرینہ واقف کار محمد ادریس کا بھی ذکر

Marfat.com

کرتا ہے، جس نے آخری سانس تک پاکستان کی محبت میں جدوجہد جاری رکھی اور حب الوطنی کا پرچم اُٹھائے شہید ہوگیا۔ محمد ادریس بہاری تھا، اس کا ذکر کر کے سلطان رضا اس پر حیرت اور دُکھ کا اظہار کرتا ہے کہ حکومت پاکستان بہاریوں کے ضمن میں سرد مہری کا مظاہرہ کر رہی ہے، کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو بنگلہ دیش میں پاکستان سے محبت کی مسلسل سزا بھگت رہے ہیں۔ اس جرم کی سزا کی چکی میں ان کی چار پانچ نسلیں پس چکی ہیں۔ سلطان رضا کو حیرت ہے کہ ان سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ بہاریوں کو حکومت پاکستان کیوں قبول نہیں کرتی اور کیوں انھیں پاکستان بلوا نہیں لیتی۔ سلطان رضا کے مضمون میں اس پیراگراف کا آخری فقرہ، جسے آپ مقطع بھی کہہ سکتے ہیں نہایت دلفریب اور چشم کشاہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ بہاری پاکستانی قوم سے کہیں زیادہ پاکستان سے پیار کرتے ہیں۔ وہ پاکستان کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں، البتہ سلطان رضا نے یہ نہیں لکھا کہ پاکستان نے کبھی بھی اپنے اثاثوں کی قدر نہیں کی اور پاکستان اثاثے ضائع کرنے کا عادی ہے۔

اس حوالے سے ایک دلچسپ سوال ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ وہ سوال سلطان رضا نے بھی اُٹھایا ہے، لیکن جواب نہیں دیا۔ سلطان رضا اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہتا ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام کی بہت بڑی اکثریت پاکستان سے علیحدگی نہیں چاہتی تھی، انھیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر تھا۔ وہ فقط چاہتے تھے کہ ان کی محرومیوں کا ازالہ کیا جائے اور ان کے مطالبات کو تسلیم کیا جائے، البتہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ کی قیادت علیحدگی کے حق میں تھی۔ شاید وہ مغربی پاکستان کی قیادت اور غلبے اور فوج کی حکمرانی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انتقال اقتدار کر کے پاکستان کو ٹوٹنے سے بچایا جا سکتا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اقتدار کی منتقلی میں رکاوٹیں کیسے پیدا ہوئیں؟ اس ضمن میں سب سے پہلی بدقسمتی جنرل یحییٰ خان کی ہوس اقتدار تھی جو فیلڈ مارشل ایوب خان کے مانند طویل عرصے تک صدارت کے مزے لوٹنا چاہتا تھا۔ یحییٰ خان نے اس مفروضے کے تحت انتخابات کروائے کہ مخلوط حکومت بنے گی، جس میں مجیب الرحمٰن کا پلہ بھاری ہوگا، چناں چہ اس نے مجیب سے صدارت کا وعدہ لینے کے بعد ون یونٹ توڑ دیا اور دونوں صوبوں کے درمیان طے شدہ برابری (Parity) کے فارمولے سے انحراف کرتے ہوئے ون مین ون ووٹ (One vote- One man) کا اعلان کر دیا، حالاں کہ ان مسائل کو انتخابات کے بعد بننے والی اسمبلی نے حل کرنا تھا۔ اس اسمبلی نے دستور سازی کرنی تھی اور ان فیصلوں کا تعلق براہ راست دستور سازی سے تھا۔ انتخابات میں بہت بڑی اکثریت حاصل کرنے کے بعد مجیب

Marfat.com

اپنے وعدوں سے روگردانی کرنے لگا۔ تب یحییٰ خان نے اپنی التفات کا رُخ بھٹو کی جانب موڑ دیا۔ مجیب در پردہ کہتا رہا تھا کہ 6 نکات کوئی مقدس شے نہیں، وقت آنے پر ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے، لیکن بہت بڑی اکثریت سے جیتنے کے بعد مجیب نے 6 نکات کو عوام کا مقدس اعتماد قرار دے دیا اور ان پر سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جرنیلوں کی شہ پر بھٹو نے اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ پی پی پی کے جو ارا کین اسمبلی ڈھاکا جائیں گے ان کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ ہم دوہرے یرغمال نہیں بننا چاہتے۔ کیا بھٹو نہیں جانتا تھا کہ انتقال اقتدار کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنے کا ردعمل مشرقی پاکستان میں کیا ہوگا؟ مشرقی پاکستان میں بغاوت کا لاوا پھٹ پڑا اور آرمی ایکشن کا جواز پیدا ہو گیا۔ آرمی ایکشن نے پاکستان توڑ دیا، جب کہ بھٹو نے آرمی ایکشن کا خیر مقدم کیا۔ ہندوستان نے اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اُٹھایا، کیوں کہ ہندوستان کے عوامی لیگ کی قیادت سے خفیہ اور گہرے رابطے تھے، جن کا اعتراف حسینہ واجد کر چکی ہے، چناں چہ عالم اسلام کی سب سے بڑی ریاست پاکستان کا اتحاد سیاست دانوں اور جرنیلوں کی ہوس اقتدار کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بنگلہ دیش ڈیفنس جرنل نے فروری 2009ء کے شمارے میں یحییٰ خان کا وہ حلفیہ خفیہ (Affidavit) بیان شایع کیا تھا، جو یحییٰ خان نے (Affidavit) کی صورت میں اپنے وکیل منظور احمد رانا کے ذریعے لاہور ہائی کورٹ میں جمع کروایا تھا۔ یحییٰ خان کا کہنا تھا کہ وہ بھٹو کے مشوروں پر عمل کرتا رہا اور بھٹو نے اسے گمراہ کیا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ یحییٰ خان حکمران تھا، وہ کسی کے کہنے پر غلط فیصلے کیوں کرتا رہا؟ کیا وہ اس طرح اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے؟ یہ بیان جرنیلوں کی سیاسی بے بصیرتی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اب پھر سلطان رضا کے مضمون کی جانب لوٹتے ہیں۔

سلطان رضا لکھتا ہے کہ اس کی پھوپھی عمرے کے لیے سعودی عرب گئیں اور کئی دن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں گزار کر ڈھاکا لوٹیں۔ میری پھوپھی نے ہمیں بتایا کہ انھوں نے طواف کے دوران ایک بزرگ خاتون کو خانہ کعبہ کے غلاف سے لپٹ کر اللہ تعالیٰ سے یہ فریاد کرتے سنا کہ اے میرے رب! جنھوں نے بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران میرے پیاروں کو مارا اور قتل کیا، تو انھیں اسی طرح کی موت دے۔ میں تم سے ان کے لیے عبرت ناک موت مانگتی ہوں۔ 14 اگست پاکستان کا اور 15 اگست ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ 15 اگست 1975ء کو ڈھاکا میں شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے خاندان کو قتل کر دیا گیا، صرف اس کی بیٹی حسینہ واجد محفوظ رہی، کیوں کہ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ 4 اپریل 1979ء کو جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی چڑھا دیا، 13 اکتوبر 1984ء کے دن ہندوستانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو خود اس کے

Marfat.com

اپنے محافظوں نے گولیوں سے بھون دیا۔ یحییٰ خان ذلت ورسوائی کے ساتھ خوف زدہ قیدی کی زندگی گزار کر مر گیا۔ وہ قیامت تک نفرت کی علامت بنا رہے گا، پھر قدرت کا انتقام صرف یہاں تک محدود نہ رہا، شیخ مجیب الرحمٰن، ذوالفقار علی بھٹو اور اندرا گاندھی کی تمام نرینہ اولاد غیر فطری موت مری۔ یہ سلطان رضا صاحب کا نقطہ نظر ہے، جس سے اختلاف کا آپ کو پورا حق ہے، لیکن غور کیجیے کہ پاکستان کو توڑنے والوں کا انجام کس قدر خوف ناک اور عبرت ناک تھا۔ تاریخ میں ملک ٹوٹتے رہے ہیں، ملکوں کے جغرافیے بھی بدلتے رہے ہیں، روس ہماری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے، لیکن انسانی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ملک توڑنے والے تمام ملکی و غیر ملکی کرداروں کا انجام ایک ہی جیسا اور اس قدر بھیانک ہوا ہو۔ اس سانحے میں تین ممالک کے سیاست دان حکمران ملوث تھے، یہ تینوں سیاسی کردار اپنے اپنے ملک کے طاقت ور، پاپولر اور عوام کے دلوں پر حکومت کرنے والے حکمران اور وزرائے اعظم تھے، جن کا انجام ایک جیسا ہوا، اس لیے اسے محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اتفاق وہ لوگ سمجھتے ہیں، جن کا خیال ہے کہ قدرت کا کاروبار حیات میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ آخر میں سلطان رضا لکھتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے، سب سے بڑا معاف کرنے والا ہے، لیکن میں نے کہیں نہیں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ معاف کر دیتا ہے؟ دسمبر 1971ء کے زخموں سے خون ٹپک رہا ہے۔ ان زخموں سے خون رِستا رہے گا۔

اب محترمہ حسینہ واجد انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے پاکستان سے محبت کرنے والوں اور 1971ء کے بحران میں پاکستان کے اتحاد کے لیے جہاد کرنے والوں کو سزائیں دلوا رہی ہے، پھانسیاں چڑھا رہی ہے۔ خدا جانے اس کا اپنا انجام کیا ہو گا؟ ذرا انتظار کیجیے۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہی ہے۔ اللہ پاک کا نظام انصاف پر قائم ہے۔ کبھی ہمیں یہ انصاف نظر آتا ہے اور کبھی نظر نہیں آتا، لیکن ہوتا ضرور ہے...... ''ظالم کو سزا ضرور ملتی ہے، بہ ہر حال ملتی ہے''۔

Marfat.com

دیکھتا چلا گیا

میں نے قیام پاکستان کے بعد سکول جانا شروع کیا۔ اس دور میں ذریعہ تعلیم اُردو تھا، انگریزی چھٹی جماعت سے پڑھائی جاتی تھی۔ حساب اور سائنس کے مضامین کی درسی کتابیں اُردو میں تھیں۔ انگریزی ذریعہ تعلیم صرف چند مشنری سکولوں تک محدود تھا، جہاں امراء و سا کے بچے پڑھتے تھے۔ گزشتہ 60 ستر برس کے دوران جتنے ادیب، شاعر، سائنس دان اور زندگی کے ہر شعبے میں قومی اور بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والے لوگ ہمارے قومی اُفق پہ اُبھرتے اور چھائے رہے، ان کی بہت بڑی اکثریت انھی اُردو میڈیم سکولوں کی فارغ التحصیل تھی۔ مجھے کہنے دیجیے کہ گزشتہ ڈیڑھ صدی میں جتنے عظیم، بے مثل اور نام ور ادیب، شاعر، فلاسفر، مذہبی سکالرز، معلم، صحافی، لکھاری، علما، سائنس دان اور ماہرین ان اُردو میڈیم سکولوں نے پیدا کیے، ان کا عشر عشیر بھی انگریزی میڈیم سکول پیدا نہ کر سکے۔ علامہ اقبالؒ مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہونے سے قبل اُردو میڈیم سکول اور مسجد کے صحن میں بیٹھ کر قرآن حکیم پڑھتے رہے، ان کی بنیاد مولوی میر حسن نے رکھی اور جب پنجاب حکومت نے علامہ اقبالؒ کو ''سر'' کے خطاب کا اعزاز دینا چاہا تو علامہ نے شرط یہ رکھی کہ پہلے میرے استاد مولوی میر حسن کو خطاب دیا جائے ،تب وہ قبول کریں گے۔ گورنر نے حیرت سے کہا، لیکن مولوی میر حسن کی کوئی تصنیف نہیں ہے، تو علامہ نے اپنی فطری حاضر جوابی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا ''میں ان کی تصنیف ہوں''۔ گورنر لاجواب ہو گیا، اس کی سوال پوچھتی زبان گنگ ہو گئی اور اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے مولوی میر حسن کے لیے بھی خطاب منظور کر لیا۔ علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے نام ور استاد آرنلڈ کے شاگرد تھے اور جب آرنلڈ واپس کیمبرج چلا گیا، تو علامہ اسے یاد کر کے سرد آہیں بھرتے تھے اور ایسے ''فراق زدہ'' خطوط

Marfat.com

لکھتے تھے، جیسے ایک عاشق اپنی دلربا محبوبہ کو لکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو تصنیف مولوی میر حسن کی کہتے تھے، جو سیالکوٹ میں عربی، فارسی اور اُردو پڑھانے میں نام کما چکے تھے اور قرآن حکیم، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی مضامین پر گہری نظر رکھنے کے سبب احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے پاکستان اور ہندوستان کے ادیبوں، لکھاریوں کی فہرست پر نظر ڈال لیں، یہ سب اُردو میڈیم سکولوں کی پیداوار تھے اور انھوں نے انگریزی بہ حیثیت ایک زبان اور مضمون کے عام طور پر چھٹی جماعت سے پڑھنی شروع کی تھی۔ فہرست طویل ہے کس کس کا نام لکھوں۔ نام لکھنے پر آؤں تو کالم میں صرف نام ہی آسکیں گے، لیکن لطف کی بات ہے کہ اُردو میڈیم نے ہمیں انگریزی کے اعلیٰ درجے کے لکھاری بھی دیے جن میں پطرس، فیض سے لے کر اقبال تک سبھی شامل ہیں، جن کی انگریزی پر انگریز بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ ان میں وہ امیر علی بھی شامل ہیں، جن کا قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ نصف صدی سے زیادہ تک ساری دنیا میں پڑھا جاتا تھا اور ان میں مولانا محمد علی جوہر بھی قابل ذکر ہیں، جن کی انگریزی دانی کا ڈنکا بجتا تھا۔ ان میں ہمارے وہ استاد بھی شامل ہیں، جو لندن، کیمبرج اور آکسفورڈ جیسی عالمی سطح کی درسگاہوں سے انگریز اساتذہ سے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہمارے دو استاد انگریزی کے مضمون میں انگلستان سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر آئے تھے اور یہ ساٹھ ستر سال قبل کا کارنامہ ہے۔ اُردو میڈیم تعلیم ان کی انگریزی دانی میں ذرہ بھر بھی حائل نہ ہوئی۔ ملالہ کو نوبل انعام ملنا ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ سائنس کے میدان میں، ہم نے آج تک ایک ہی نوبل پرائز یافتہ سائنس دان پیدا کیا ہے، جس کا نام ہے، ڈاکٹر عبدالسلام۔ انھوں نے جھنگ کے پسماندہ علاقے سے اُردو میڈیم میں میٹرک کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے بھی رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میٹرک میں پورے پنجاب میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ کئی دہائیوں تک ان کا میٹرک کے نمبروں کا ریکارڈ محفوظ رہا، جسے بالآخر ہمارے ایک سینئر رفیق کار چودھری منظور احمد نے توڑا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کا میٹرک کے نمبروں کا ریکارڈ توڑنے والے چودھری منظور سیالکوٹ سے تھے، اُردو میڈیم کی پیداوار تھے، انھوں نے سی ایس پی کے مقابلے کا امتحان دیا اور پولیس گروپ کے لیے منتخب ہوئے۔ مجھ سے سروس میں کئی سال سینئر تھے۔ آئی جی پنجاب رہے اور بعدازاں انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ تعینات ہوئے۔ میں کوئی دس بارہ برس جی او آر ون میں ان کا پڑوسی رہا۔ ایمان دار اور شریف النفس چودھری منظور کسی اور کی غلطی پر ایل بی ڈبلیو یعنی او ایس ڈی ہو گئے۔ وہ

Marfat.com

آئی جی پنجاب تھے، تو یار لوگ کہتے کہ چودھری صاحب نے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام کا ریکارڈ توڑا ہے، جب کہ پنجاب کا انتظامی و سیاسی سربراہ میٹرک بھی نہیں۔ میٹرک نہ ہونا کوئی بات نہیں مسئلہ بصیرت اور صلاحیت کا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول سمندر کو کوزے میں بند کر دیتا ہے۔ فرمایا مانگنا ہے تو اللہ سے مقدر مانگو میں نے بڑے بڑے عالموں کو جاہلوں کی نوکری کرتے دیکھا۔ یار و برا نہ منانا، میں نے پاکستان کے اکثر حکمرانوں کو بصیرت اور اہلیت کی نہیں، بل کہ مقدر کی پیداوار دیکھا، تب میں مقدر کا ضرورت سے زیادہ قائل ہو گیا، لیکن اس موضوع پر پھر کبھی۔

بات قدرے دُور نکل گئی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا ہمارے مایہ ناز سائنس دانوں ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ثمر مند مبارک اور ان کے اکثر ساتھیوں کا تعلق اُردو میڈیم سکولوں سے ہے، جنھوں نے پاکستان کو ایٹمی قوت بنایا۔ قائداعظم بھی کئی برسوں تک مدرسۃ السلام سندھ میں پڑھتے رہے، جہاں اُردو اور انگریزی ساتھ ساتھ پڑھائی جاتی تھیں۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا ڈاکٹر عبدالسلام نوبل انعام یافتہ کا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں یہ بھی لکھ دوں کہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں گورنمنٹ کالج لاہور کے ہوسٹل میں دو برس تک اس کمرے میں مقیم رہا، جہاں اکٹر عبدالسلام بہ حیثیت طالب علم رہے تھے۔ کمرے کی نسبت سے ہوسٹل کا بزرگ ملازم مجھے بتایا کرتا تھا کہ جب چودھری عبدالسلام ہوسٹل میں آئے، تو ان کے ہاتھ میں لوہے کا صندوق تھا۔ سر پر پگڑی، شلوار کرتہ کے ساتھ پاؤں میں دیسی کُھسہ پہنے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں آنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ انگریزی لباس کے عادی ہوئے، لیکن میں جب ان سے 89-1988ء میں کئی بار ملا، تو انھیں ہمیشہ شلوار قمیض میں دیکھا۔ ان دنوں وہ لاہور آئے ہوئے تھے۔ ایک رات کھانے پر باتیں ہو رہی تھیں، تو کہنے لگے کہ کچھ عرصہ قبل جب میں انگلستان میں مقیم تھا، تو میری بیٹی سکول میں زیر تعلیم تھی۔ ایک دن وہ میرے پاس ریاضی کا سوال لے کر آئی کہ ابا جان مجھے سمجھا دیں، مجھ سے حل نہیں ہو رہا۔ کہنے لگے میں تھوڑی دیر تک سر کھپاتا رہا، بالآخر معذرت کے لہجے میں کہا بیٹی مجھے یہ سوال نہیں آتا۔ وہ میرے منہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی ابا جی آپ کو نوبل پرائز کیسے مل گیا؟ یہ بات لطیفہ بھی ہے اور حقیقت بھی، کیوں کہ اکثر عالم و فاضل حضرت جب علم کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں، تو سکول کے سوالات بھول جاتے ہیں۔ ہوسٹل کے جس کمرے میں ڈاکٹر عبدالسلام مقیم رہے، وہاں ہندوستان کا عظیم گلوکار سہگل بھی مقیم رہا۔ میرے وہاں آنے سے پہلے اور نکلنے کے بعد اس کمرے میں سیکڑوں طلبا مقیم رہے، لیکن نہ ان میں سے کوئی عبدالسلام بنا اور نہ ہی سہگل بن سکا۔ دراصل جگہوں، اینٹوں اور گارے کی

Marfat.com

نسبت بھی اینٹوں اور گارے کے مانند بے جان ہی ہوتی ہے۔ مولوی میر حسن نے سیکڑوں شاگردوں کو پڑھایا، لیکن اقبال ایک ہی بنا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ہوسٹل کا بوڑھا زلف تراش مجھے بتایا کرتا تھا کہ سہگل پڑھائی کے بجائے ''سُر'' پر ساری توجہ دیتا تھا۔ ہاں میں اس دور میں زلف تراش کے پاس بھی جاتا تھا ، کیوں کہ میں اس وقت میں بہ ذات خود گھنے بالوں والا ''زلفی'' تھا اور مہینے میں دو بار حجامت بنواتا تھا۔ میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہوتے ہی وہاں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ میرے دوست اور اُردو کے مشہور شاعر پروفیسر قیوم نظر مجھے اکثر کہا کرتے تھے ''پروفیسر یار تم ایک فوٹو کھنچوا کر رکھ لو۔ سسرال کو دکھانے کے لیے کہ تم پیدائشی گنجے نہیں ہو، کیوں کہ تمھارے بال تیزی سے گر رہے ہیں''۔ ہاں تو حجام مجھے بتایا کرتا تھا کہ سہگل غسل خانے میں گھس کر پانی کی ٹونٹی کھول کر گھنٹوں گایا کرتا تھا۔ اس کے والد صاحب آئے تو میں نے بتایا آپ کا صاحبزادہ پڑھتا نہیں، بس گاتا رہتا ہے، بالآخر وہ مایوس ہو کر اسے واپس گھر لے گئے۔ سہگل افسر، فلمی ہیرو، شاعر یا عالم یا حکمران تو نہ بن سکا لیکن ''سُر'' کی دنیا میں ابدی مقام حاصل کر گیا۔ یارو ہر شخص کا اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے، جس کا کچھ حصہ وہ ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور کچھ حصہ اپنی محنت سے بناتا ہے۔ شاید محنت کی توفیق بھی مقدر ہی کا حصہ ہو، مجھے معلوم نہیں۔ دوستو امام غزالی نے کیا خوب بات کہی ہے، بل کہ ایک راز سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ''دنیا نصیب اور آخرت محنت سے ملتی ہے، لیکن لوگ محنت دنیا کے لیے کرتے ہیں اور آخرت کو نصیب پہ چھوڑ دیتے ہیں''۔ دراصل اولادِ آدم تضادات، غلط فہمیوں اور فریب میں گرفتار ہے۔

Marfat.com

اقبالؒ، ایک آفاقی شاعر اور مفکر

علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا تھا کہ نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روتی ہے، تب کہیں چمن میں دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ دیدہ ور وہ ہوتا ہے، جسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت، دوررس نگاہ، اعلیٰ بصیرت اور باطن کی روشنی سے نوازا ہو۔ خود علامہ اقبال بھی ایسے ہی دیدہ ور تھے، جو ہندوستان کے مسلمانوں کو صدیوں بعد نصیب ہوئے۔ اپنی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجیے، اس سے قبل ہمیں کوئی ایسا دیدہ ور نصیب ہوا، جس کے کلام نے مایوس دلوں کو گرمایا ہو، تشنہ روحوں کو تڑپایا ہو اور آزادی کی اُمنگ پیدا کر کے تاریکی میں بھٹکتی قوم کو منزل کی راہ دکھائی ہو۔ ہماری صدیوں پر محیط تاریخ میں یہ کارنامہ علامہ اقبالؒ کے مقدر میں لکھا تھا۔ اسی لیے ہم اقبال کو عقیدت کی بلندیوں پر بٹھاتے اور اسے رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کو وفات پائے تقریباً 76 برس گزرے اور اس عرصے میں اقبالؒ ایک آفاقی شاعر اور فلاسفر کے مقام پر فائز ہو چکا ہے۔ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا ترقی یافتہ ملک ہو، جہاں اقبال پر تحقیق، تشریح اور لیکچروں کا سلسلہ جاری نہ ہو۔ میں گزشتہ پانچ دہائیوں سے اقبال کو پاکستان، ایران، افغانستان اور دنیائے اسلام سے نکل کر مغرب میں تیزی سے پھیلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اقبالیات کے اثر اور مطالعے کے دائرے وسیع ہو رہے ہیں اور اقبال تاریخ کا حصہ بن کر عالمی سطح کے فلاسفرز کی صف میں ممتاز جگہ پا چکا ہے۔ محمد عمر سہیل سابق ڈائریکٹر اقبال اکادمی نے اپنے ایک مضمون میں ذکر کیا تھا کہ صرف 1997ء میں الٰہ آباد، تہران، بلجیم، لندن، نیویارک، کیمبرج اور ہائیڈل برگ میں اقبال کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جن میں اقبال اور عصر حاضر، اقبال اکیسویں صدی میں اور اقبال کی موجودہ حیثیت پر دنیا کے ممتاز مفکرین نے مقالے پڑھے۔ اب تک اقبال پر مغربی ممالک، دنیائے اسلام اور پاکستان میں سیکڑوں کتابیں چھپ چکی ہیں اور

Marfat.com

دن بہ دن اقبالیات پر تحقیق و تالیف میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میرا ادراک ہے کہ اقبال کے اَبدی اور آفاقی کلام کا دائرہ اثر بہ تدریج وسیع ہو کر پھیلتا جائے گا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اقبال کا فلسفہ خودی ہو یا اقبال کا شاہین اور مردِ مومن یہ فلسفے مغرب کے لیے بھی اتنے ہی دلکش ہیں، جتنے مشرق کے لیے۔ ان کے اثرات غلام ذہنوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں اور آزاد سوچ پر بھی نقش ثبت کرتے ہیں، اگرچہ اقبال کے فلسفے کی جڑیں قرآن حکیم اور اسلام میں پیوست ہیں، لیکن مغرب انھیں مذہب نہیں، بل کہ فلسفے کے نقطہ نظر سے پڑھتا ہے، اس لیے اقبال کے کلام کا نفوذ قرآن حکیم کا اعجاز لگتا ہے۔

یہ بھی تاریخ کی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ہر عظیم شخصیت، ہر دیدہ ور اور ہر پیام برکو بہ ہر حال مخالفت، تنقید اور کبھی کبھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاید یہ قانون قدرت ہے، کیوں کہ یہ سلسلہ ساری انسانی تاریخ پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف اقبال کو پاکستان کے عوام و خواص اپنے دلوں کے تخت پر بٹھاتے اور آنکھوں میں سجاتے ہیں، تو دوسری طرف کچھ لوگ اقبال پر کنکریاں بھی پھینکتے رہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا اقبال سے فکری تضاد یا تصادم تھا یا پھر انھوں نے اقبال کو پڑھا اور سمجھا ہی نہیں۔ کبھی کبھار عقیدت اور محبت کی فضا میں اقبالؒ کے خلاف ایسی ایک آدھ آواز بلند ہوتی، پھر اپنی موت مر جاتی ہے، جب کہ فکر اقبال روز بہ روز طاقت ور ہو رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، تو وہاں ایک پروفیسر صاحب کا چرچا تھا۔ چرچا کیا تھا ان کا ذکر نفرت کا لبادہ پہنے ہوتا۔ یہ ایوب خان کا لبرل دور تھا اور پینا پلانا ہر قسم کی پابندی سے آزاد تھا۔ کلاس فیلوز سے پتا چلا کہ میرے داخلے سے پہلے وہاں ایک اُردو کے پروفیسر صاحب تھے، جو بہک کر کلاس میں آتے اور اقبالؒ کی تنقیص شروع کر دیتے۔ چاند پر تھوکنے والا اپنا ہی حلیہ خراب کرتا ہے۔ احتجاج ہوا، حالاں کہ احتجاج گورنمنٹ کالج لاہور کے مزاج کے منافی تھا، چناں چہ ان پروفیسر کو کہیں کسی دور دراز گوشے میں پھینک دیا گیا۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔ وہ صاحب وفات پا چکے، اس لیے نام لکھنا معیوب لگتا ہے۔ آج اقبال عالمی ادب کے اُفق پر چھا چکا ہے، جب کہ اس بے چارے کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے مخالفین اقبال و جناح کا یہی انجام ہوتے دیکھا ہے۔ ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ میں 1982ء میں سرکاری دورے پر تاشقند گیا۔ اس دور میں روس ایک خوف ناک سپر پاور تھا اور افغانستان پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ کمیونزم نے روسی عوام کے ذہنوں اور زبانوں پر تالے لگا رکھے تھے اور خوف و جبر کا یہ عالم کہ کمیونسٹ پارٹی کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا تھا۔ قیام کے تیسرے چوتھے دن مجھے تاشقند یونیورسٹی سے دعوت

Marfat.com

نامہ ملا۔ وہاں لے جایا گیا اور ینٹیل سٹڈیز کے سربراہ نے استقبال کیا۔ یہ صاحب مغل بادشاہ بابر کے خاندان سے تھے اور نہایت خوش اخلاق و متواضع۔ اپنے ہاتھ سے کشمش والا پلاؤ کھلاتے رہے، جو تاشقند میں میرے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ ان کے دفتر میں بیٹھا تھا، تو میں نے گاندھی اور ایک، دوسرے ہندوستانی لیڈروں اور لکھاریوں کی تصویریں دیکھ کر پوچھا کہ اقبال کی تصویر نظر نہیں آ رہی۔ کہنے لگے اقبال اسلام اور انقلاب کا شاعر ہے اور روسی قیادت اسلام اور انقلاب دونوں سے خوف زدہ ہے۔ یہاں فارسی بولی اور سمجھی جاتی ہے اور بہت سے لوگ شوق سے اقبال کا فارسی کلام ذاتی سطح پر پڑھتے ہیں۔ روس ٹوٹنے کے بعد ازبک زبان میں بھی اقبال پر کتابیں چھپ چکی ہیں۔ سنٹرل ایشیا کے مسلمان اقبال سے عقیدت رکھتے ہیں، حالاں کہ حکومت پاکستان نے اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا۔

یہ تنگ دامن کالم موضوع سے انصاف نہیں کر سکتا۔ بہ ہر حال اقبال کی آفاقی حیثیت کا کچھ اندازہ اپنوں اور غیروں کی رائے سے ہوتا ہے۔ ممتاز امریکی مورخ پروفیسر سٹینلے والپرٹ اپنی کتاب ''جناح آف پاکستان'' میں لکھتا ہے کہ انسانی تاریخ میں چند افراد نے واضح انداز میں تاریخ کا رُخ بدلا، چند حضرات نے دنیا کا نقشہ بدلا، قومی ریاست کے قیام کا کریڈٹ تو کسی کو بھی نہیں دیا جا سکتا۔ جناح واحد شخصیت ہے، جس نے بہ یک وقت تینوں کارنامے سرانجام دیے۔ اتنا فراخدلانہ اور لازوال فیصلہ اس امریکی پروفیسر نے سنایا ہے، جو ہماری طرح قائداعظم کی عقیدت کا اسیر بھی نہیں تھا۔ اب سنیے انسانی تاریخ میں بہ یک وقت تین کارنامے سرانجام دینے والے واحد لیڈر جناح کا اقبال کے بارے میں فیصلہ اور اندازہ کیجیے اقبال کتنا بڑا انسان تھا۔ ''گو میرے پاس سلطنت نہیں ہے، اگر مجھے سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے، تو میں اقبال کو منتخب کروں گا''۔ اسی قائداعظم نے 23 مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد فرمایا تھا ''آج اقبال زندہ ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے۔ ہم نے وہی کر دکھایا، جو اقبال چاہتے تھے''۔ گویا اقبال جناح کے فکری قائد تھے۔ ایسے نابغہ روزگار اور دیدہ ور اقبال کی تنقیص...... کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔

اقبال کی انقلابی فکر کہاں کہاں پہنچی یہ بہ ذات خود تحقیق کا موضوع ہے۔ اقبال کی آفاقیت کی ہلکی سی جھلک ممتاز لکھاری ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''اقبال ممدوح عالم'' میں ملتی ہے۔ مجھے تہران میں کچھ دانش وروں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو پتا چلا کہ ایرانی دانش ور انقلاب ایران میں کلام اقبال کے اثرات کے معترف ہیں۔ عصر حاضر کے ممتاز ایرانی مفکر اور لکھاری ڈاکٹر علی شریعتی نے تو کھل کر اس کا اعتراف کیا

Marfat.com

ہے۔ان کا ایک مختصر سا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے ''اقبال ہمارے عہد میں اسلامی فکر اور انسانی و بین الملکی اسلامی بصیرت کے مظہر ہیں۔میں ان کو ''علیؑ گونہ'' (علیؑ نما) پاتا ہوں، یعنی ایک ایسا انسان جو علیؑ کی سنت کا پیرو ہے، لیکن وہ بیسیویں صدی کی انسانی استعداد کا بھی مکمل نمونہ ہے''۔یہی ڈاکٹر علی شریعتی کہتے ہیں ''سید جمال الدین افغانی کو میں تحریک اسلامی کا بزرگ ترین بانی سمجھتا ہوں، مگر اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ سید جمال کی آغاز کردہ تحریک اپنی تکمیل کے راستے طے کرتی ہوئی، اقبال کی منزل تک پہنچی''۔ افغان کی پین اسلام ازم اقبال کی ملت کے سانچے میں ڈھل گئی۔کون جانے یہ خواب کبھی حقیقت بن جائے۔ہم نے تاریخ میں خوابوں کو حقیقت بنتے دیکھا ہے، جن میں پاکستان، ایران، افغانستان اور روس، مشرقی یورپ وغیرہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

کینیڈا کے ممتاز فلسفی چارلس ٹیلر نے اقبال کی کتاب کو غزالی کی کتاب سے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کی شاعری مولانا رومی کی مثنوی کی یاد دلاتی ہے۔مولانا روم کی مثنوی کو تفسیر قرآن سمجھا جاتا ہے۔برطانوی پروفیسر آرنلڈ اور نکلسن، روسی نکولائی گلیبوف، مصری ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ترکی ڈاکٹر عبدالقادر کراحان، بنگالی ٹیگور اور امریکی فاسٹر نے جس طرح اقبال کو خراج تحسین پیش کیا ہے، اس سے ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔بہ قول ممتاز لکھاری عزیز احمد ''اگر اقبال کے کلام میں آفاقیت نہ ہوتی تو ہمیں بیشتر ممالک میں اقبال پر کتابیں نہ ملتیں۔آخر کیا وجہ ہے کہ امریکا، جاپان، چین، روس، ایران، مصر، افغانستان، ترکی، مراکش، انڈونیشیا حتیٰ کہ سری لنکا میں بھی اقبال شناس ہی ملتے ہیں، بل کہ اقبال کے تراجم بھی دستیاب ہیں''۔وجہ فقط یہی ہے کہ اقبال بہ ہر حال آفاقی شاعر تھا اور آفاقی شاعر ہے اور بین الاقوامی سطح پر اقبال پاکستان کا تعارف ہے۔

یارو...... ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ علامہ اقبالؒ ہماری قوم اور ہمارے ملک میں پیدا ہوئے۔

Marfat.com

مقاماتِ اَدب کے تقاضے

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اس روز مجھے بڑی جھاڑیں پڑیں، کیوں کہ میں نے مقامات ادب کے تقاضوں کو مجروح کیا تھا۔ کچھ جھاڑیں خارجی ہوتی ہیں، جو بزرگوں، استادوں یا والدین سے پڑتی ہیں اور کچھ جھاڑیں باطنی ہوتی ہیں، جو انسان کو اندر سے ''موصول'' ہوتی ہیں۔ جتنا ضمیر زندہ اور روشن ہوگا، اسی قدر جھاڑیں اندر سے پڑیں گی، لیکن فی الحال اس تفصیل کو رہنے دیجیے۔

ہوا یوں کہ ایک کالم میں، میں نے یہ لکھا کہ قرآن حکیم کا فرمان ہے، جب بندہ نوافل کے ذریعے اللہ پاک سے قرب حاصل کرتا رہتا ہے، تو پھر اللہ پاک بھی اس سے اس قدر محبت کرنے لگتے ہیں کہ اس کے کان بن جاتے ہیں، جن سے وہ سنتا ہے، آنکھ بن جاتے ہیں، جن سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ بن جاتے ہیں، جن سے وہ پکڑتا ہے، پاؤں بن جاتے ہیں، جن سے وہ چلتا ہے'' دراصل مجھ سے کوتاہی یہ ہوئی کہ میں نے وقت کے دباؤ کے تحت کالم جلدی میں لکھتے ہوئے حافظ پر زور نہ ڈالا اور اسے قرآن پاک کا فرمان لکھ دیا، حالاں کہ یہ حدیث قدسی ہے۔ آپ ماشاء اللہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، اس لیے آپ کو حدیث اور حدیث قدسی کا فرق سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ بہ ہر حال اس کوتاہی یا فروگزاشت پر مجھے خوب جھاڑیں پڑیں، حالاں کہ دوسرے ہی دن میں نے کالم میں اس کی وضاحت بھی کر دی تھی۔ جھاڑیں اس لیے پڑیں کہ اللہ تعالیٰ یا قرآن پاک کا معاملہ ہو، حضور نبی کریمؐ یا سیرت نبوی، حدیث مبارکہ یا صحابہ کرام یا اولیا کرام جیسی عظیم اور مقدس ہستیوں کا ذکر ہو، تو نہایت احتیاط اور ذمہ داری سے بات کہنی اور لکھنی چاہیے، کیوں کہ یہ سب مقامات ادب ہیں اور ادب کا تقاضا ہے کہ بولنے یا لکھنے سے پہلے تحقیق کر لی جائے اور ہاں، بات ادھوری بھی نہ لکھی جائے، کیوں کہ اس سے غلط فہمی پھیلتی اور ابہام کا دائرہ وسیع ہوتا

Marfat.com

ہے۔ مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ ادب ہی مذہب، فقر، ذکر اور روحانیت کی روح یا اولیں شرط یا پہلی سیڑھی ہے، اگر آپ پہلی سیڑھی سے ہی پھسل گئے، تو پھر آگے کیسے چلیں گے۔ یارو! ادب مسلمان کی زندگی کا محور اور مرکز ہے۔ حضرت شیخ علی ہجویری المعروف حضرت داتا گنج بخش نے کشف المحجوب میں ادب پر زور دیتے ہوئے اور آداب کی اقسام بیان کرتے ہوئے، ایک ایسا واقعہ لکھا ہے، جسے پڑھ کر میں کانپ گیا۔ لکھتے ہیں ''ایک دن حضور نبی کریمؐ پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور انھوں نے آپؐ سے کہا ''اے محمدؐ! اس طرح سے بیٹھو جس طرح سے ایک غلام کو بیٹھنا چاہیے''۔ میرے خیال کے مطابق عام لوگوں کے لیے دین میں بڑی آسانیاں اور سہولتیں ہیں، لیکن یہ واقعہ ادب کی اہمیت کو واضح کرتا ہے، غور کیجیے کہ ادب اگر چہ قلبی کیفیت ہے، لیکن اسے ظاہر پر بھی نافذ کرنا ضروری ہے۔

معاف کیجیے گا بات ذرا دُور نکل گئی۔ آج کی اس تحریر کا محرک ایک ممتاز کالم نگار کا کالم بنا، جس میں انھوں نے سیرت نبویؐ کے حوالے سے ایک بات ادھوری لکھی۔ اس سے تھوڑا سا ابہام پیدا ہوتا ہے اور ادب کے تقاضے مجروح ہوتے ہیں، چناں چہ میں نے ضروری سمجھا کہ اس کی وضاحت کر دوں، کیوں کہ صرف یہی کالم نگار نہیں، میں نے اکثر لکھاریوں کو اس ضمن میں ادھوری بات لکھتے دیکھا ہے۔ سیرت نبویؐ پڑھتے ہوئے منافق اعظم یا رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول کا ذکر آتا ہے جس نے قدم قدم پر منافقت کے جال بچھائے اور نہ صرف نبی آخر الزماںؐ، بل کہ اسلام کو نقصان پہنچانے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آپ جانتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبی قبیلہ خزرج کا رئیس تھا اور مدینہ طیبہ کے دو طاقت ور قبیلے اَوس اور خزرج اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے، لیکن حضور نبی کریمؐ کی مدینہ منورہ میں ہجرت کے سبب اس فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ یہ کانٹا یا محرومی عمر بھر عبداللہ بن اُبی کے دل میں کھٹکتی رہی اور وہ انتقام لیتا رہا، حتیٰ کہ غزوہ اُحد کے موقع پر اس شخص نے صریح غداری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھی لے کر میدان جنگ سے واپس چلا گیا۔ حالات کی نزاکت کا اندازہ کیجیے کہ قریش کا لشکر تین ہزار پر مشتمل تھا، جب کہ حضور نبی کریمؐ مدینہ طیبہ کے دفاع کے لیے ایک ہزار لوگوں کو لے کر نکلے، جس میں سے تین سو عبداللہ بن اُبی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ یہ منافق اعظم حضرت عائشہؓ کے خلاف تہمت پھیلانے میں بھی ملوث تھا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضور نبی کریمؐ نے اس کا جنازہ پڑھایا اور روایات کے مطابق اس کے کفن کے لیے اپنا کرتہ مبارک بھی عنایت فرمایا۔

یہاں تک تو بات درست ہے، لیکن یہ حقیقت نامکمل اور بات ادھوری ہے، جس سے مقامات

Marfat.com

ادب کے تقاضے مجروح ہوتے ہیں، کیوں کہ یہاں یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ حضور نبی کریمؐ نماز جنازہ پڑھا چکے تو سورہ التوبہ کی آیت نمبر 84 نازل ہوئی، جس میں یہ حکم ہوا ''اور آیندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑا ہونا، کیوں کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے''۔

پس منظر کے طور پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عبداللہ بن اُبی کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عبداللہ نہایت مخلص اور نیک مسلمانوں میں سے تھے۔ وہ اپنے والد کی وفات کے موقع پر حضور نبی کریمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کفن میں لگانے کے لیے کرتہ مانگا۔ آپؐ نے فراخ دلی سے عطا کر دیا، پھر نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی۔ آپؐ اس کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ اپنی رحمت کی بنا پر دعاے مغفرت بھی کرنے میں تامل نہ کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی اور آپ کو آیندہ کے لیے روک دیا گیا۔ اس حوالے سے صحیح بخاری میں کئی احادیث موجود ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یارو! یہ مقامات اُدب ہیں، ان میں قدم رکھتے ہوئے کچھ کہنے یا لکھنے سے پہلے تحقیق کر لو اور ذمہ داری سے پوری بات لکھو تا کہ نہ غلط فہمی پھیلے اور نہ ہی اُدب کے تقاضے مجروح ہوں۔

Marfat.com

......بولوں تو تری رُسوائی ہے

آج کل ملک میں غلغلہ ہے جناب وزیر اعظم کے نصاب تعلیم سے متعلق حکم نامے کا اور مجھے اپنے ایک دیرینہ، عزیز اور بزرگ دوست یاد آرہے ہیں، جن کا نام تھا شورش کاشمیری۔ میری ان سے پہلی ملاقات بھی عجیب سا حادثہ تھی۔ میں اپنے استاد پروفیسر مرزا صفدر (ماہر اقبالیات پروفیسر شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور) کے ساتھ شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) کے فٹ پاتھ پر ٹہل رہا تھا کہ اتنے میں ایک ہوٹل سے حضرت شورش کاشمیری برآمد ہوئے۔ ان کا مرزا صاحب سے یارانہ اور بے تکلفی تھی۔ دونوں مجلس اقبال کے متحرک کارکن، بل کہ منتظم تھے۔ مرزا صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا ''یہ ہیں اعلیٰ حضرت شورش کاشمیری ایڈیٹر ''شیطان''۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا، کیوں کہ شورش کاشمیری مرحوم و مغفور کے ہفت روزہ ''چٹان'' کا مرزا صاحب نے خوب ہم وزن لفظ ڈھونڈا تھا۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ میں زندگی بھر کبھی اُردو کا باقاعدہ طالب علم نہیں رہا۔ اس کے باوجود مرزا صاحب کو استاد کہہ رہا ہوں۔ بعض اوقات انسان رسمی استادوں سے کہیں زیادہ غیر رسمی استادوں سے سیکھتا ہے۔ رسمی استاد وہ ہوتے ہیں، جو آپ کو کلاس میں پڑھاتے ہیں اور غیر رسمی استاد وہ ہوتے ہیں، جو زندگی کی کلاس میں پڑھاتے ہیں۔ بی اے میں پولیٹیکل سائنس اور ہسٹری کا طالب علم تھا لیکن میری دوستی پروفیسر مرزا منور اور پروفسر قیوم نظر سے تھی، جو شعبہ اُردو سے تعلق رکھتے تھے۔ زیادہ وقت بھی انھی کے ساتھ گزرتا۔ زمانہ طالب علمی سے مرزا صاحب سے ایسا تعلق اور رشتہ قائم ہوا کہ ان کی زندگی کے آخری لمحات تک نبھا۔ لاہور کے بہت سے بزرگ دوستوں کے جنازے میں نے اپنے کندھوں پر اُٹھائے، لیکن ان میں میرے لیے سب سے ''بھاری'' جنازہ مرزا صاحب کا تھا، جو اپنے ساتھ میری نصف زندگی کی یادیں اور محبتیں بھی لے گیا اور

Marfat.com

مجھے تنہا کر گیا۔ وہ بہتی ہوئی علم کی ندی کے مانند تھے، جس سے چلتے پھرتے اپنی اپنی طلب کے مطابق پیاس بجھائی جا سکتی تھی۔ یارو عجب لوگ تھے۔ آج تو ان کا ذکر کرنا بھی استادوں اور معلموں کو شرمانے کے مترادف ہے۔ مرزا صاحب زندگی کے آخری کئی برس بیمار اور صاحب فراش رہے، لیکن حافظے کا یہ عالم ، اگر فون کر کے کبھی کوئی علمی حوالہ پوچھا تو جواب ملتا فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر شاید چوتھی یا پانچویں لائن ہے۔ درویش صفت مرزا منور کی شخصیت میں صوفیانہ جاگ لگی ہوئی تھی، جس کا راز ان سے قربت کی صورت میں کھلتا تھا، فقط ظاہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اپنی قلیل تنخواہ کا ایک تہائی مستحقین میں تقسیم کر کے وہ قناعت کی نہایت مطمئن زندگی گزارتے تھے۔ افسوس آج کا استاد صبح سے رات تک کئی جگہوں پر پڑھاتا اور دولت کمانے کی مشین بننے کے باوجود خوشی اور ذہنی و قلبی آسودگی سے محروم زندگی گزارتا ہے۔ مطالعے کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ میں اکثریت کی بات کر رہا ہوں، اقلیت کی نہیں۔ یارو معاف کرنا! حسب معمول بات دُور نکل گئی۔ جب ماضی کا ذکر آئے تو ''صفدر نامہ'' کے صفحات ذہن میں کھلتے جاتے ہیں اور قلم یادوں میں کھو جاتا ہے، ورنہ بات شروع ہوئی تھی جناب شورش کاشمیری مرحوم کے ذکر سے، جن سے بعد ازاں ایسی دوستی ہوئی کہ آج بھی ان کی قہقہوں کی آواز کانوں میں گونجتی اور دل میں محبت کا رس گھولتی ہے۔ ایوب خان کا مارشل لا اپنی پوری آمریت کے ساتھ مسلط تھا، زبان اور قلم پہ پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ میں نیا نیا گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا تھا اور چٹان کا قاری تھا۔ آج مجھے اس دور کے چٹان کا ایک سرورق یاد آ رہا ہے۔ ایوبی آمریت کے حوالے سے چٹان کے سرورق پر چند سیاستدانوں کی تصویریں چھپی تھیں، جن کے نیچے کسی موزوں گانے کا بول لکھا گیا تھا۔ مولانا مودودی کی تصویر کے نیچے ایک پاپولر گانے کا بول لکھا گیا تھا، جس سے میں بہت محظوظ ہوا۔ وہ بول تھا ''چپ ہوں تو کلیجا جلتا ہے، بولوں تو تیری رسوائی ہے''۔ کچھ یہی حال میرا بھی ہے، میں جناب وزیر اعظم صاحب کے نصاب کے حوالے سے جاری کردہ حکم نامے کے بارے کیا لکھوں۔ تعلیم سے میری قلبی و ذہنی وابستگی دہائیوں پر محیط ہے۔ سرکاری طور پر میں صوبے اور وفاق دونوں میں تعلیم کا سیکرٹری رہا ہوں۔ بہت سی حکومتوں اور حکمرانوں کو دیکھا ہے اور ان کی ترجیحات سے بھی آگاہ ہوں۔ میں وفاقی حکومت میں قومی تعلیمی پالیسی بنانے والی ٹیم کا سربراہ بھی تھا اور اللہ سبحانہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ ہم نے بہت محنت کی۔ نہ ہی صرف ماہرین تعلیم، اساتذہ، طلبا، علما اور دانش وروں کو پالیسی بنانے میں شریک کیا، بل کہ عام لوگوں اور والدین سے بھی تجاویز مانگیں اور معقول تجاویز کو پالیسی میں جگہ دی۔ میں اس وقت یونیسکو کے ایجوکیشن

Marfat.com

کمیشن کا وائس چیئرمین منتخب ہوا تھا، چناں چہ پالیسی بنانے میں بین الاقوامی ایجنسیوں سے بھی استفادہ کیا۔ پالیسی بن گئی اور اعلان بھی ہو گیا، لیکن جب عملدرآمد کا وقت آیا، تو وہی ہوا، جو سرکاری رپورٹوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میرا زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ ہے کہ تعلیم کبھی بھی ہمارے حکمرانوں کی ترجیح نہیں رہی، ان کی تعلیم سے محبت صرف زبانی اعلانات اور سطحی اقدامات تک محدود ہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت صرف دو فیصد تعلیم کے لیے مختص کرنا ہے۔ میرے تجربے کے مطابق مسئلہ نیت کا نہیں، مسئلہ ویژن، صلاحیت اور ترجیحات کا ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو کبھی تعلیم کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہوا ورنہ سیکڑوں غیر ملکی رپورٹیں (Studies) یہ ثابت کرتی ہیں کہ سب سے زیادہ منافع بخش سرمایہ کاری تعلیم میں انوسٹمنٹ ہے۔ اسرائیل جیسے چھوٹے سے ملک نے صرف سائنس، ٹیکنالوجی اور تعلیم کے زور پر ساری اسلامی دنیا کو نیچا دکھا رکھا ہے، یعنی پنجابی محاورے کے مطابق تھلے لگا رکھا ہے۔ تعلیم بے شک صوبوں کے حوالے سے کیجیے، لیکن نصاب کو اٹھارھویں آئینی ترمیم کے ساتھ صوبوں کے حوالے کرنا ایک غلط فیصلہ تھا، جس کے نتائج پاکستانی قوم بھگتے گی، لیکن اس سے سیاست دانوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے بچے بیرون ملک بہترین درسگاہوں میں پڑھتے ہیں۔ تعلیمی شعبے کی زبوں حالی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق صرف اس سال پنجاب میں تیس لاکھ بچے سرکاری سکولز چھوڑ کر جا چکے ہیں، ملک بھر میں دو کروڑ بچے سکولوں سے باہر ہیں، جنھیں سکولوں میں ہونا چاہیے۔ ہزاروں سکولوں میں بنیادی سہولیات تو درکنار اساتذہ ہی موجود نہیں یا ضرورت سے بہت کم ہیں۔ دیہی علاقوں میں سائنس ٹیچرز عنقا ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ معاشی، سماجی اور سیاسی انقلاب اعلیٰ تعلیم کا مرہون منت ہے، لیکن ہماری یونیورسٹیاں تحقیق اور ریسرچ سے تائب ہو چکی ہیں۔ عالمی ریٹینگ یا رینکنگ کی بات چھوڑیے پاکستانی یونیورسٹیوں کا ایشیا کی رینکنگ میں بھی نام نہ ہونے کے برابر ہے۔ نصاب ترقی یافتہ ممالک سے کم تر ہیں اور حکمران اس معاملے کو سمجھنے سے عاری ہیں۔ دوسری طرف جوہر قابل ملک سے فرار ہو چکا ہے یا فرار ہونے کے راستے تلاش کر رہا ہے، جب کہ حکمران لیپ ٹاپ تقسیم کر کے نہ جانے کس انقلاب کی راہ دیکھ رہے ہیں، حالاں کہ اسی رقم سے کم از کم دو ورلڈ کلاس مفت یونیورسٹیاں بنائی جا سکتی تھیں۔ ہماری یونیورسٹیاں اہلیت کھو چکیں، لیکن حکمرانوں میں اتنا شعور بھی نہیں کہ وہ بنیادی سہولتیں مفت فراہم کر کے عالمی سطح کی یونیورسٹیوں کے کیمپس ہی پاکستان میں کھلوا سکیں۔ اگر عمران میانوالی کی نمل یونیورسٹی میں بریڈفورڈ یونیورسٹی جیسی اعلیٰ درسگاہ کی تعلیم اور ڈگری کا انتظام کر سکتا ہے تو ہماری حکومتیں کیوں نہیں کر

Marfat.com

سکتیں۔ متحدہ عرب امارات نے ہم سے بہت بعد آغاز کر کے اس میدان میں کچھ کامیابی حاصل کر لی ہے۔ حکمرانوں کو کون سمجھائے کہ ملک کو موٹرویز اور صرف لاہور کی میٹرو بس سروس پر سالانہ اکیس ارب روپے خرچ کرنے کے بجائے سنگاپور کے مانند ٹیکنالوجی، گورننس اور عالمی سطح کے درسگاہوں کی ضرورت ہے اور انھی سے ملک میں خوشحالی کا انقلاب آئے گا۔ کالم کا دامن تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ میری ذاتی رائے میں مسئلہ نیت کا نہیں، مسئلہ ویژن، صلاحیت اور ترجیحات کا ہے۔ دوستو کیا کروں؟

ے چپ ہوں تو کلیجا جلتا ہے
بولوں تو تری رُسوائی ہے

Marfat.com

اِقبال سے قائدِ اعظم تک

پھر اُس روز مجھے خوب جھاڑیں پڑیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ میری لغزش کے مقابلے میں یہ جھاڑیں بہت کم تھیں۔ معاملہ ہو حضور نبی کریمؐ کی سیرت کا، احکام خداوندی اور قرآن حکیم یا حدیث مبارکہ کا تو حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور انسان کو بغیر تحقیق کے نہ کچھ اس حوالے سے لکھنا چاہیے اور نہ ہی زبان سے کہنا چاہیے، کیوں کہ یہ صرف اَدب ہی کا تقاضا نہیں، بل کہ میرے رَبّ کا حکم بھی ہے۔ ادب عشق کا پہلا قرینہ یا پہلی سیڑھی ہے اور جنھیں عشق رسولؐ کا دعویٰ ہے، انھیں اس حوالے سے ہر بات بہت سوچ سمجھ کر کہنی چاہیے تا کہ ان مقدس موضوعات کے بارے میں نہ ابہام پھیلے اور نہ ہی کسی نامکمل یا ادھوری بات کے سبب غلط فہمی پیدا ہو۔ ہم کالم نگاروں کا مسئلہ بھی دلچسپ ہے۔ عام طور پر کالم وقت کے دباؤ کے تحت لکھا جاتا ہے اور اپنی یادداشت پر بھروسا کیا جاتا ہے، چناں چہ تصدیق یا تحقیق کا وقت ملتا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات کالموں میں سنسنی خیز، ادھوری اور کبھی کبھی غلط انفارمیشن دیکھنے میں آتی ہے۔ اسی سے وابستہ یہ مسئلہ بھی ہے کہ اکثر کالم نگار اپنی تحریر کو سجانے (Decorate) کے لیے جذباتی فقرے ایجاد کرتے ہوئے مبالغے کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس سے وہ قاری کے دل کی تاروں کو تو چھیڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن اس مبالغے میں سچ کا قتل واقع ہو جاتا ہے، جس پر مقدمہ بھی درج نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں معصوم ہوں اور دوسرے گناہ گار۔ حق یہ ہے کہ میں بھی اس حمام میں ننگا ہوں اور اپنی کوتاہیوں کا احتساب کرتا رہتا ہوں۔ چھپا ہوا کالم پبلک پراپرٹی ہوتا ہے، جس پر رائے زنی کا ہر ایک کو حق پہنچتا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ''کچھ'' قارئین کی رائے بلاتحقیق، متعصب، نظریاتی آویزش یا ادھورے سچ پر مبنی ہے، میں نہ کوئی وضاحت کرتا ہوں اور نہ ہی دفاع کیوں کہ

Marfat.com

رائے زنی قاری کا حق ہے، اگر چہ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

گزشتہ دنوں کچھ ایسا ہی حشر ''ذوق یقیں'' اور ''مسجد'' والے میرے کالموں کا ہوا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ آرم سٹرانگ کو ممنوع دوائیوں کے استعمال کے الزام میں اعزازات سے محروم کیا جا چکا ہے، لیکن دوست بھول گئے کہ میرا فوکس اور مرکزی خیال قوت ارادی، ذوق یقیں اور یقین محکم تھا، جس سے انسان فائدہ اُٹھا کر بیماریوں، مصائب اور مسائل پر کسی حد تک قابو پا سکتا ہے۔ مقصد امید کی شمع جلانا تھا، نہ کہ ناامیدی اور مایوسی کی تاریکی پھیلانا۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ لوگ کینسر جیسی موذی اور جان لیوا بیماری کا نام سنتے ہی مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتے ہیں اور بستر پر لیٹ کر موت کا انتظار کرنے لگتے ہیں، جب کہ آرم سٹرانگ کی مضبوط قوت ارادی یہ سبق دیتی ہے کہ انسان ذوق یقیں سے فائدہ اٹھا کر، زندگی میں متحرک رہ کر اور بیماری کو بھلا کر بیماری کے باوجود بڑے سے بڑے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے اور وقتی طور پر موت اور بیماری کی اذیت کو بھی شکست دے سکتا ہے۔ وقتی طور پر میری مراد یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے، یہ نہ ٹل سکتا، نہ ہی ملتوی ہوتا ہے، لیکن آخری لمحہ آنے سے قبل محض بیماری کے خوف سے زندگی ہی میں مر جانا اس ذوق یقیں اور قوت ارادی کی نفی ہے، جو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنی نوع آدم کو عطا کی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات اسی شعور کی بنا پر ہے، جس سے حیوانات محروم رکھے گئے ہیں۔ اس شعور میں سوچ، سمجھ، فکر، اپنی ذات پر اختیار، برے بھلے کی تمیز، پہاڑوں، سمندروں، صحراؤں کو مسخر کرنے کی صلاحیت اور قوت ارادی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مسئلہ تو صرف اتنا سا ہے کہ ہم اللہ سبحانہ تعالیٰ کی دی گئی صلاحیتوں اور ہمارے اندر موجود خوابیدہ نعمتوں کا نہ ادراک، نہ تجزیہ اور نہ ہی کھوج لگاتے ہیں اور پانی کی سطح پر بہتے ہوئے بے جان تنکے کے مانند زندگی گزار دیتے ہیں، حالاں کہ یہ نہ منشائے الٰہی ہے اور نہ ہی ہمارا مقدر۔ مقدر کے ایک حصے پر ہمارا بس نہیں چلتا، لیکن معتد بہ حصہ ہم خود بناتے اور تعمیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مقدر بنانے اور تعمیر کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کا کھوج لگانا، انھیں استعمال کرنا اور ان سے فائدہ اُٹھانا ضروری ہے اور اسی کا انسان کو یوم حساب جواب دینا پڑے گا۔ اپنی صلاحیتوں کا کھوج لگانا اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کی دی گئی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھانا ہی مرشدی علامہ اقبال کا سادہ الفاظ میں فلسفہ ''خودی'' ہے۔ میں کیا ہوں، میرے اندر کیسے کیسے اور

Marfat.com

کون سے جہان آباد ہیں، میں کیا کرسکتا ہوں، میرا ذوق یقیں اور میری قوت ارادی مجھے چاند پر قدم رکھنے کے قابل بھی بنا سکتی ہے، میں سمندروں کے رُخ موڑ سکتا ہوں اور پہاڑوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہوں، میں ستاروں پہ کمند ڈال سکتا ہوں، میں اپنے مصائب و مسائل پر قابو پا سکتا ہوں اور اپنا مقدر بدل سکتا ہوں، یہی فوری ہے، جب کہ ہم نے خودی کو جھوٹی غیرت، تکبر کی ایک قسم اور جعلی عزت نفس سمجھ رکھا ہے۔
اقبال کی خودی قرآن حکیم اور سیرت نبویؐ سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

یہ منزل تبھی آتی ہے، جب انسان اپنا مقام پہچانتا ہے۔ مقام کی پہچان حاصل کرنے میں قوت ارادی ایک مؤثر ہتھیار ہے۔ شیطان انسان کو مایوسی کا سبق دیتا اور تاریکی پھیلاتا ہے جب کہ رحمٰن انسان کو امید کی زندگی، ذوق یقیں کی نعمت اور آگہی کی روشنی عطا کرتا ہے، اسی لیے تو اقبال کہتا ہے۔

جو ہو ذوق یقیں پیدا، تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

میرے ناقص مطالعے کے مطابق اپنے بازوں پہ بھروسا، جدوجہد، اپنی ذات پر اعتماد اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کی تائید غیبی یا حمایت پہ یقین ہی خودی ہے، جس کی ایک مثال قائداعظم تھے۔ اسی لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ صرف علم ہی مسلمان یا مومن کی کھوئی ہوئی میراث نہیں، بل کہ جدوجہد، اپنی پہچان اور رحمت خداوندی پر مکمل یقین بھی مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث ہیں۔ اقبال کو ستاروں پہ کمندیں ڈالنے والے نوجوانوں سے محبت تھی اور اللہ سبحانہ تعالیٰ نے کائنات کو انسان کے زیر نگیں کر کے ستاروں پہ کمندیں ڈالنے کا پیغام دے دیا ہے۔ یارو معاف کرنا! بات دُور نکل گئی۔ رہا دوسرا کالم بہ عنوان ''مسجد'' ظاہر ہے کہ بعض حضرات کو مسجد کا ذکر نا گوار گزرتا ہے۔ ان کی روشن خیالی تاریکی کی سرحدوں کو چھوتی اور مذہب سے خوف زدہ رہتی ہے، انھوں نے خوب میرے لتے لیے اور تاریخ مسخ کرنے کا الزام لگایا۔ دوستو، بات دلیل سے کی جاتی ہے، زور زباں سے نہیں۔ پڑھنے کی تکلیف آپ نہیں کرتے صرف طعنوں اور اپنے مخصوص نظریاتی زاویے پر گزارہ کرتے ہیں۔ کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں، کیوں کہ میرا لیڈر قائداعظمؒ اور میری جماعت پاکستان ہے۔ میں نے اس کالم میں شریف الدین پیرزادہ کی تحقیقی کتاب کا اقتباس دیا تھا۔ آپ تحقیق اور دانش وری میں ان سے بڑے پہلوان ہیں، تو تحقیق سے اسے غلط ثابت کیجیے نہ کہ مجھ فقیر کو تاریخ مسخ کرنے کا الزام دیجیے۔ 11 اگست 1947ء کی قائداعظم کی تقریر پر میں کئی بار لکھ

Marfat.com

چکا، پھر بھی انھیں گلہ ہے کہ اس سے صرف نظر کرتا ہوں۔ میری گنتی کے مطابق قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل 101 بار اور قیام پاکستان کے بعد چودہ بار اعلان کیا کہ پاکستان کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی اور یہ کہ قرآن مجید ہمارے قانون و آئین کا منبع ہے۔ فروری 1948ء میں قائداعظم نے امریکی عوام کے نام پر براڈ کاسٹ پیغام میں پاکستان کو پریمیر (Premier) اسلامی ریاست قرار دیا۔ یہ بیان سارے جہان نے سنا، نام نہاد روشن خیالوں کے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ مجھے اس سے کیا لینا، لیکن صحیح تاریخ یہی ہے کہ اس کے شواہد موجود اور واضح ہیں اس لیے تاریخ وہ مسخ کرتے ہیں، جو قائداعظم کی تقریریں پڑھتے نہیں اور اپنے نظریات ٹھونستے ہیں۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ قائداعظم کی گیارہ اگست والی تقریر کا مکمل متن کسی کتاب میں موجود ہی نہیں۔ سیکڑوں بار لکھ چکا ہوں کہ قائداعظم کی گیارہ اگست کی مکمل تقریر بہت سی کتابوں میں موجود ہے، حتیٰ کہ خورشید یوسفی کی مرتب کردہ قائداعظم کی تقاریر اور بیانات (چار جلدیں انگریزی) میں شامل ہے۔ خدا کے لیے کتاب سے دوستی کرو، آخر کب تک روشن خیالی کے نام پر تاریخی حقائق سے انکار کرتے رہو گے۔

پاکستان نہ اسلامی ریاست ہے، نہ اس کا امکان ہے۔ اکبر بادشاہ اور جودھا بائی کی محبت میں گرفتار کیوں خوف زدہ ہیں؟ آپ کی اطلاع کے لیے 14 اگست 1947ء کے انتقال اقتدار کے دن جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اکبر بادشاہ کی پیروی کا ذکر کیا، تو قائداعظم کا دو ٹوک جواب تھا، ہمارے آئیڈیل ہمارے نبی کریمؐ ہیں، جنھوں نے ہمیں رواداری، برداشت اور عفو و درگزر کا سبق دیا ہے۔ میں نے نہ قائداعظمؒ کو دیکھا، نہ سنا۔ میں تو ان کی تقریروں کے حوالے سے ان کے ویژن یا تصور پاکستان کی بات کرتا ہوں۔ قائداعظم سے وفا اور پاکستان سے محبت کا یہی تقاضا ہے۔

Marfat.com

قائدِ اعظم کی مسجد......؟؟

خیال آیا کہ لایعنی سیاست کے بخیے ادھیڑنے اور سیاست دانوں کو تختہ مشق بنانے کے بجائے ایسا کالم لکھا جائے، جس سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہو یا کم از کم ان کی تاریخی یادیں تازہ ہوں۔ آج کل ہمارے کچھ دانش ور ہندو مصنفین کی پراپیگنڈہ کتابیں پڑھ کر لوگوں کو تاریخ کے نام پر گمراہ کر رہے ہیں، حالاں کہ تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر تحقیقی کتابیں پڑھیں، ہر قسم کے شواہد اور دستاویزات کا بہ غور مطالعہ کریں اور پھر واقعات کے پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوششیں کریں، کیوں کہ انھیں باقی بہت سے کاموں کے علاوہ دانش وری کی دکان اور ٹی وی شو سجانا ہوتے ہیں، چناں چہ وہ تاریخ کو بھی اخبار کے مانند پڑھتے اور سنسنی خیز بیانات دے کر کنفیوژن فروخت کرتے رہتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پروگرام کے سامنے بے چارے کالم کی حیثیت سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے، تاہم اپنی اپنی استعداد کے مطابق جو کچھ ہو سکے، وہ کر دینا چاہیے۔

بات ذرا دُور نکل گئی۔ ہوا یوں کہ کچھ عرصہ قبل جماعت اسلامی کے دو بزرگ راہنما مجھے ملنے تشریف لائے۔ میرا گھر تو درویش کا ڈیرہ ہے، ہر کسی کے لیے دروازے کھلے رہتے ہیں، چناں چہ ہر قسم کے لوگ تشریف لاتے ہیں اور اپنے اپنے تجربات اور مطالعہ کی گٹھڑیاں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ان سے سیکھتا ہوں اور، اگر ضرورت پڑے تو اپنا نقطہ نظر بھی بیان کر دیتا ہوں۔ سیاسی جماعتوں کے علاوہ اساتذہ، طلبا اور قوم کا درد رکھنے والے حضرات وقت اور فاصلے کی قربانی دے کر تشریف لاتے ہیں، تو میری حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور میرا کمرہ ان کی محبت کی خوشبو سے معطر ہو جاتا ہے۔ یہ حضرات مجھے پہلی بار ملنے

Marfat.com

آئے تھے۔ باتوں باتوں میں، میں نے ان سے پوچھا کہ جماعت اسلامی کا قیام کس سال عمل میں آیا تھا۔ فوراً جواب ملا کہ 1941ء میں..... میں نے چھیڑنے کے لیے پوچھا کہ بھلا جماعت کا سیکرٹری جنرل کون تھا؟ امیر کا اس لیے نہ پوچھا کہ امیر اور جماعت اسلامی کا نام لازم و ملزوم ہیں اور ہر شخص امیر جماعت اسلامی کا نام جانتا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ یہ ایک معمول کی بات تھی، کیوں کہ عام طور پر سپہ سالار اور پارٹیوں کے بڑے لیڈر اتنی بڑی شخصیات ہوتی ہیں کہ ان کے نائبین چراغ تلے اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں۔ میں نے ان سے یہ سوال اس لیے پوچھا تھا کہ پچھلے دنوں دستاویزات اور کتابوں میں جھانکتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ میری نظر سے گزرا، جس کی کئی جہتیں ہیں اور جو اکثر قارئین کی معلومات میں اضافے کا باعث ہوگا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ جماعت اسلامی کے 1941ء میں قیام کے کچھ عرصے بعد جماعت کے سیکرٹری جنرل جناب قمرالدین خان کو دہلی بھجوایا گیا، جہاں جماعت کی درخواست پر ہندوستان کی ممتاز مذہبی شخصیت راجہ محمود آباد نے ان کی قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ یہ ملاقات قائداعظم کی رہائش گاہ پر ہوئی اور کوئی پینتالیس منٹ جاری رہی۔ اس ملاقات میں قمرالدین خان نے جماعت اسلامی کے منشور، سرگرمیوں اور پروگرام پر روشنی ڈالی اور قائداعظم سے کہا کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کا وعدہ کریں۔ قائداعظم نے مختصر مگر واضح جواب دیا اور کہا کہ آپ کے اور مسلم لیگ کے پروگرام میں کوئی تفاوت اور تضاد نہیں، لیکن حالات جس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں اور سیاست میں جس رفتار سے پیش رفت ہو رہی ہے، ہم صرف اسلامی ریاست کی نوعیت اور تشریح پر اٹک کر رہ نہیں سکتے۔ ان کے الفاظ تھے ''میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے لیے جدوجہد کرتا رہوں گا اور آپ بھی اس سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھیں یہ ضروری نہیں کہ ہمارے پلیٹ فارم ایک ہی ہوں'' پھر قائداعظم نے رُک کر کہا ''میں مسجد کے لیے زمین چاہتا ہوں۔ جب ہمیں اس مقصد کے لیے زمین مل جائے اور تو ہم مل کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مسجد کیسے تعمیر کرنی ہے''۔ قمرالدین خان قائداعظم کی بات سن کر اور خاص طور پر مسجد کے استعارے سے بہت خوش ہوئے۔ قائداعظم نے انھیں انتباہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام ہماری اولین ترجیح اور مقصد ہے، جہاں تک روحانی پاکیزگی اور بالیدگی کا تعلق ہے، وہ بعد کی بات ہے''۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قمرالدین خان نے روحانی پاکیزگی پر زور دیا تھا، جب کہ قائداعظم کا خیال تھا کہ یہ معاملات بعد کی بات ہیں، پہلے مسجد کے لیے زمین تو حاصل کر لیں۔ حالات قومی اتحاد اور

Marfat.com

مسلمانوں کے ایک پلیٹ فارم پر اجتماع کا تقاضا کرتے تھے اور قائداعظم کو احساس تھا، اگر اس وقت نازک مذہبی مسائل چھیڑ دیے گئے تو مختلف مذہبی فرقے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیں گے اور مسلمانوں کی قوت تقسیم ہوکر کمزور ہو جائے گی۔

اسی پس منظر میں جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کے بعد اپنے دینی اور تربیتی پروگرام کا آغاز کیا اور مولانا مودودی کو ریڈیو پاکستان سے درس و تدریس کی اجازت دی گئی، لیکن قائداعظم کے انتقال کے بعد جماعت اسلامی بھی زیرِ عتاب آ گئی۔ میرے مطالعے کے مطابق جماعت اسلامی تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی مخالف نہیں تھی، البتہ مسلم لیگ کی قیادت پر تنقید کرتی تھی، کیوں کہ جماعت اسلامی کو اندیشہ تھا کہ مسلم لیگ کی مغرب زدہ قیادت پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہیں کر سکے گی۔ جماعت اسلامی کی مسلم لیگی لیڈروں پر تنقید اور ان کی زندگیوں پر اعتراض سے یہ تاثر ابھرا کہ جماعت قیام پاکستان کے خلاف ہے۔ میرے مشاہدے کے مطابق ایوبی مارشل لا نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے گیارہ برس تک جماعت اسلامی پر پاکستان کی مخالفت کے کوڑے کچھ اس طرح برسائے کہ یہ لیبل جماعت پر چپک کر رہ گیا اور جماعت کی وضاحتیں صدا بہ صحرا بن کر رہ گئیں۔ (جو حضرات محترم قمرالدین خان اور قائداعظم کی ملاقات بارے پڑھنا چاہیں وہ شریف الدین پیرزادہ کی انگریزی کتاب ارتقائے پاکستان کا مطالعہ کریں)۔

مسجد کے ذکر سے مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آ گیا، جو برمحل ہوگا۔ بہت سے حضرات سمجھتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مانند جمعیت علمائے ہند کے تمام اکابرین نے پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ تاثر صحیح نہیں ہے۔ یہ واقعہ اس تاثر کی نفی کرتا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جمعیت علمائے ہند کے ایک گروہ نے پاکستان کی حقیقت کو دل سے تسلیم کر لیا تھا۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، واقعات و کرامات مرتب، مولانا سید رشیدالدین حمیدی، مراد آباد (ہندوستان) نامی کتاب کے صفحہ نمبر 136 پر یہ واقعہ درج ہے، جسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ''پاکستان بن جانے کے بعد ایک صاحب نے مجلس میں (حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی)'' سے یہ سوال کیا کہ پاکستان کے لیے اب آپ کا کیا خیال ہے؟ تو حسب معمول سنجیدگی اور بشاشت کے ساتھ فرمایا کہ مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب بن گئی، تو وہ مسجد ہے''۔ آج 67 برس بعد میں سوچ رہا ہوں کہ ہم نے اس ''مسجد'' کا کیا حشر کر دیا ہے؟

Marfat.com

مذمت سے مرمت تک

سچی بات یہ ہے کہ آج الطاف بھائی کا بیان پڑھ کر مزا آ گیا۔ عام طور پر وزرا اور سیاست دانوں کے بیانات پڑھ کر ہم بدمزہ ہوئے، لیکن مدتوں بعد آج ایک مزے دار بیان پڑھا تو لطف آ گیا۔ پی پی پی کے جیالے محترم خورشید صاحب نے لفظ مہاجر کو گالی قرار دیا، تو مجھے ذہنی کوفت ہوئی، دکھ اور صدمہ ہوا اور میں دل ہی دل میں ان کی مذمت کر کے خاموش ہو گیا، حالاں کہ میں خود مہاجر نہیں اور نہ ہی میرے خاندان کو قیام پاکستان کے وقت خون اور آگ کے سمندر سے گزرنا پڑا، لیکن میں ہجرت اور لفظ مہاجر کے تقدس، ایثار اور جذبے کی گہرائی سے واقف ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام کی پہلی ہجرت نبی کریمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ کی ہجرت تھی، جو دین کی حفاظت اور سربلندی کے لیے کی گئی اور اسی ہجرت کے نتیجے کے طور پر مدینہ منورہ کی پہلی اسلامی مملکت وجود میں آئی تھی۔ 1947ء میں تقسیم ہند اور قیام پاکستان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

یہ اپنی جگہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان نے ایک ایسی مملکت کا خواب دکھایا تھا، جس کی بنادیں اسلامی اصولوں پر استوار کی جانی تھیں۔ قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل بارہا کہا کہ پاکستان کے سماجی، سیاسی اور آئینی ڈھانچے کی بنیاد اسلامی اصولوں پر تعمیر کی جائے گی، پھر فروری 1948ء میں اپنے پیغام بنام امریکی عوام میں پاکستان کو ''پریمیر اسلامک'' ریاست قرار دیا۔ گھر بار، جائیداد، بزرگوں کی قبروں اور محبت کی تمام علامتوں کو ترک کر کے ہجرت کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ مہاجرین کی بہت بڑی اکثریت نے اسلام کے نام پر اور اسلامی مملکت کے وعدے پر ہجرت کی اور لازوال قربانیاں دے کر ہجرت مدینہ کی یاد تازہ کر دی۔ اس ہجرت کے ''مہاجروں'' کو گالی قرار دینا گناہ ہی

Marfat.com

نہیں، بل کہ تحریک پاکستان کی روح اور قائداعظم کے ویژن سے بھی بغاوت ہے۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں کہ کیا کوئی عاقل و بالغ شخص بہ قائمی ہوش و حواس ایسی بات کہہ سکتا ہے؟ بہ ہر حال الطاف بھائی نے بالکل درست کہا ہے کہ لفظ مہاجر کو گالی کہنے والے کی مذمت نہیں، بل کہ مرمت ہونی چاہیے۔ مجھے مذمت کا ہم وزن لفظ مرمت پڑھ کر بڑا مزا آیا، اگر چہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے سیاست دان مرمت سے سمجھنے والی مخلوق نہیں، ان کی اصلاح کے لیے تو سرجیکل آپریشن درکار ہے۔ خاص طور پر پاکستان کو لوٹ کر بیرون ملک بنائی گئی جائیدادیں اور موٹے موٹے بینک بیلنس تو سرجیکل آپریشن کے بغیر واپس نہیں آ سکتے۔

''مرمت'' کے سلسلے کی دوسری اہم کڑی سپریم کورٹ کا یہ عزم ہے کہ ''سچ کا معیار مقرر کرنا پڑے گا، نتائج کچھ بھی ہوں، عدالت صادق و امین کی تشریح کرے گی''۔ اس بیان سے امید کی شمع روشن ہوئی ہے، کیوں کہ مجھے علم ہے کہ جسٹس جواد خواجہ سچے انسان ہیں اور اپنے الفاظ کی حرمت کی نگہبانی کرتے ہیں۔ عوامی منتخب نمایندوں کا صادق و امین ہونا آئینی تقاضا ہے اور آئین کی دفعات 62/63 کا مطالبہ ہے۔ عدالت کا خیال ہے کہ شاید اس طرح پارلیمنٹ کی آدھی نشستوں کے لیے بھی امیدوار نہ مل سکیں، جب کہ عام اندازہ ہے کہ اگر آئین کی ان شقوں کا صحیح اطلاق کیا جائے تو شاید اوپر سے لے کر نیچے تک 90 فیصد منتخب نمایندے نااہل ہو جائیں گے۔ عام نمایندوں کا ذکر کیا، یہاں تو ہمارے حکمران ہماری آنکھوں کے سامنے جھوٹ بولتے رہے ہیں اور سرکاری خزانے کو عیش و عشرت پر صرف کر کے امانت میں خیانت کرتے رہے ہیں۔ تفصیل میں نہ جانا ہی بہتر ہے، کیوں کہ یہ سب کچھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً سیاست دانوں اور حکمرانوں کی غلط بیانیاں ''پکڑی'' بھی جاتی رہی ہیں، لیکن اس سے ہماری قوم کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بھلا ایسا کیوں ہے؟

سپریم کورٹ تو صرف عوامی نمایندوں اور آئینی عہدیداروں کے لیے صادق و امین کی تشریح کرے گی اور ظاہر ہے کہ صادق و امین کا سیدھا سا مطلب ''سچا'' ایمان دار اور امانت دار ہوتا ہے، لیکن اے کاش! اس تشریح کو عام لوگوں پر بھی لاگو کر دیا جائے، تو مسئلہ ہی حل ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے، کیوں کہ ندی کا رُخ تو موڑا جا سکتا ہے، لیکن سمندر کا رُخ موڑا نہیں جا سکتا۔ جیسی قوم ویسے فرشتے کے مصداق اپنے اردگرد نگاہ ڈالیے تو پتا چلے گا کہ سچ کے حمام میں ساری قوم ننگی ہے الا ماشاء اللہ ایک چھوٹی سی اقلیت کے ماسوا جو خوف خدا کی ماری جھوٹ سے اجتناب کرتی ہے۔ وہ دکان دار ہو یا ٹیکسی

Marfat.com

ڈرائیور، بزنس مین ہو یا سرکاری کارندہ، استاد ہو یا شاگرد، ووٹر ہو یا امیدوار، لیڈر ہو یا کارکن، صنعت کار ہو یا خریدار، غرض ہر کوئی دن رات بے ایمانی اور جھوٹ کا کاروبار کرتا اور اس قدر اعتماد سے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ شعر یاد آتا ہے۔

ایسا بدلا ہوں تیرے شہر کا پانی پی کر
جھوٹ بولوں تو ندامت نہیں ہوتی مجھ کو

کیا ایسی قوم، جس کی بڑی اکثریت دن رات جھوٹ کے تانے بانے بنتی اور بے ایمانی کرتی ہو، وہ صادق وامین لوگوں کو ووٹ دے گی؟ کیا اسے اپنے لیڈر یا حکمران کے پکڑے جانے والے جھوٹ پر شرمندگی ہوگی؟ بالکل نہیں اور یہی وجہ ہے کہ قوم سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود انھی لوگوں کو بار بار ووٹ دیتی ہے اور صاف ستھرے کردار والوں کو اقتدار سونپنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی، کیوں کہ وہ محض مذمت نہیں کریں گے، بل کہ مرمت بھی کریں گے۔ حیران ہوں کہ سپریم کورٹ جھوٹ کے سمندر میں صداقت وامانت کے جزیرے کیسے بنائے گی، لیکن ہاں! ان کا کام جزیرے بنانا نہیں صرف تشریح کرنا ہے۔ ان کا کام مذمت کرنا ہے، مرمت کرنا نہیں۔ نہ جانے مرمت کا کام کب شروع ہوگا؟

یہاں تک لکھ چکا ہوں تو خیال آرہا ہے کہ خود بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مہاجر تھے، اگرچہ پیدا تو وہ سندھ میں ہوئے، لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد بمبئی میں آباد ہو گئے تھے، جہاں انھوں نے زندگی کے تقریباً پچاس برس گزار دیے۔ پاکستان نہ بنتا تو وہ بمبئی میں ہی رہتے، چناں چہ وہ قیام پاکستان سے چند روز قبل ہجرت کر کے کراچی آئے۔ پاکستان کے سب سے پہلے وزیراعظم اور قائداعظم کے بعد مقبول ترین لیڈر جناب لیاقت علی خان بھی مہاجر تھے۔ اس لیے لفظ مہاجر کو ''گالی'' کوئی ناخلف ہی کہہ سکتا ہے، ورنہ بابائے قوم اور ان کے قریبی رفقا کا احترام ہم سب پاکستانیوں پر لازم ہے۔ الطاف بھائی سے میرا اکثر اختلاف رہتا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس حوالے سے ان کا مذمت سے لے کر مرمت تک کا سفر مجھے جائز اور مناسب لگتا ہے۔

Marfat.com

گستاخ اَکھیاں

ارادہ تو کسی اور موضوع پر لکھنے کا تھا، لیکن ایک عظیم ولی اُللہ کا ایک فقرہ مجھے تڑپا گیا، پھر ذہن اُدھر منتقل ہو گیا اور سوچ الفاظ کی گہرائی ناپنے اور گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہو گئی۔ بعض اقوال، باتیں اور فقرے سمندر سے زیادہ گہرے اور وسیع ہوتے ہیں اور انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بہ روئے کار لا کر بھی ان کا صرف ایک آدھ پہلو ہی سمجھ سکتا ہے اور معانی کے سمندر میں غوطے لگا کر صرف چند ایک موتی ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یقیناً ایسی باتیں نکلتی تو اُللہ کے پیاروں کے معصوم ہونٹوں سے ہیں، لیکن ان کے پس پردہ حکمت الٰہی کارفرما ہوتی ہے، جو ہمیشہ ظاہر ہونے کے لیے بے تاب رہتی ہے اور اظہار کے وسیلے تلاش کرتی رہتی ہے تاکہ لوگوں تک پیغام پہنچے، وہ غور کریں اور اپنی اصلاح کریں۔ سچ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ سبحانہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق سے بے پناہ پیار کا ثبوت ہے کہ قدرت اپنی حکمت اور اپنے رازوں میں اپنی مخلوق کو شریک کرتی رہتی ہے، روشنی کی کرنیں انسانوں کے ذہنوں میں منعکس کرتی رہتی ہے اور لوگوں کو رضائے الٰہی کے حصول کا راستہ دکھاتی رہتی ہے۔

یہ الفاظ ہیں حضرت بایزید بسطامیؒ کے، جن کے سحر اور حصار میں، میں کھو گیا اور پھر ذہن ریگستانوں کی خاک چھانتے ہوئے سرسبز و شاداب وادیوں میں گھومنے لگا۔ کلام، چوں کہ اردو میں نہیں اس لیے اگر الفاظ کے جوڑنے میں تھوڑی سی لغزش یا چوک ہو جائے تو معاف کر دیجیے گا۔ مفہوم بہ ہر حال یہی ہے۔ حضرتؒ کا فرمان ہے کہ جب اللہ پاک کسی شخص سے راضی اور خوش ہوتے ہیں، تو اسے تین اوصاف عطا فرماتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھیں کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی نعمتوں اور عطا کی کوئی حد نہیں۔ اللہ پاک اپنے بندے سے جس قدر راضی ہوتے چلے جاتے ہیں، اسی قدر اس پر نعمتوں اور عطا کی بارش

Marfat.com

کرتے چلے جاتے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے، جو تین صفات بتائی ہیں وہ بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک پیمانہ اور معیار ہیں، اگر آپ اندازہ لگانا چاہیں کہ کسی شخص سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کس قدر خوش اور راضی ہیں، تو دیکھیں کہ اس میں ان تینوں صفات میں سے کتنی صفات پائی جاتی ہیں اور پھر یہ کہ اس میں تینوں صفات کی کتنی مقدار پائی جاتی ہے، کیوں کہ یہ توفیق اللہ پاک کی جانب سے ملتی ہے اور شاید ہر کسی کو ایک جیسی نہیں ملتی۔ جتنا جتنا کسی کا ظرف اور جس قدر وہ رضائے الٰہی کا مستحق ہوتا ہے، اسی قدر اسے توفیق ملتی ہے اور اسی قدر یہ اوصاف پیدا کیے جاتے ہیں۔ بلاشبہ ان اوصاف کا ودیعت ہونا اور ملنا رضائے الٰہی کا ثبوت ہے، لیکن سب میں ان کی وسعت، مقدار، گہرائی اور اظہار ایک جیسا نہیں ہوتا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ عشق الٰہی اور عشق رسولؐ میں ڈوبے ہوئے عظیم ولی اللہ تھے۔ ان کا فرمان ہے کہ جب اللہ سبحانہ تعالیٰ کسی بندے سے خوش ہوتے ہیں، اس کے اعمال کے سبب اس سے راضی ہوتے ہیں، تو اسے تین انعامات دیتے ہیں۔ اول سخاوت، یعنی اسے سخی بنا دیتے ہیں۔ دوم اسے خوش اخلاقی عطا فرماتے ہیں، سوم اسے زمین کی سی عاجزی عطا فرماتے ہیں۔ مجھے کہنے دیجیے کہ میں زمین کی سی عاجزی کی تشبیہ پڑھ کر تڑپ گیا اور سوچنے لگا کیا انسان زمین کے مانند عاجز ہوسکتا ہے؟ زمین پر ہم پاؤں مارتے، کدالیں، ہتھوڑے اور بیلچے ''چلاتے'' اور اسے ہر طرح سے لتاڑتے ہیں، لیکن یہ کبھی معمولی سا احتجاج یا ردعمل کا اظہار بھی نہیں کرتی۔ کیا انسان ایسا عاجز ہوسکتا ہے؟ ہاں بلاشبہ ایسا ہوسکتا ہے، اگر یہ عطا رب کریم کی ہو اور انسان کی اپنی پیدا کردہ مصنوعی عاجزی نہ ہو، جس کا لبادہ انسان کبھی کبھار مصلحت یا ضرورت کے تحت اوڑھ لیتا ہے۔ مصنوعی عاجزی کا بھانڈا جلد یا بہ دیر پھوٹ اور ٹوٹ جاتا ہے، لیکن رَب کی عطا کردہ توفیق وقت کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہ عاجزی فقر کی اولین علامت ہے، جسے بابا فرید گنج شکر نے یوں بیان کیا ہے ''ادیں ہو جا بندیا جیویں ککھ مسیت...... یعنی اپنے آپ کو یوں بنالو، جیسے مسجد کے فرش پر پڑا تنکا، جسے لوگ ہر وقت مسلتے اور لتاڑتے رہتے ہیں، لیکن وہ اُف تک نہیں کرتا۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صفائی صرف بے جان اشیا میں ہی ہوسکتی ہیں، لیکن اللہ پاک قادر مطلق ہیں، وہ چاہیں تو یہ صفت کسی انسان کو بھی عطا فرما دیں۔ ہم نے اولیائے کرام میں ہمیشہ یہ صفت نمایاں اور واضح طور پر دیکھی اور پڑھی ہے۔

ہاں تو بات چلی تھی سخاوت سے...... سخاوت کے معانی اور شعبے نہ صرف نہایت گہرے، ہمہ جہت اور وسیع ہیں، بل کہ اس کی اقسام بھی اَن گنت ہیں۔ غریبوں، مستحق خاندانوں کے لیے ذاتی وسائل

Marfat.com

کے منہ کھول دینے سے لے کر ایثار و قربانی، خوش اخلاقی، ہر قسم کی مدد، بے لوث خدمت اور دکھ بانٹنے وغیرہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔سخی وہ بھی ہوتا ہے، جو سارا مال اللہ کی راہ میں دے دیتا ہے، ہر ضرورت مند کے لیے گھر اور دل کے دروازے کھلے رکھتا ہے، ہر مصیبت زدہ کی مدد کو پہنچتا ہے، ہر زخم پر مرہم رکھتا ہے، کسی کو دیتے ہوئے حساب کتاب سے بے پرواہ اور بے نیاز ہوتا ہے اور سخی وہ بھی ہوتا ہے جو مخلوق خدا میں محبتیں تقسیم کرتا، اعلیٰ مقصد کے لیے اپنا قیمتی وقت دیتا اور اصلاح کے لیے بے لوث الفاظ کی بارش کرتا ہے۔مختصر یہ کہ سخاوت کے اَن گنت درجے ہیں اور اَن گنت قسمیں ہیں۔دراصل سچا سخی اپنے آپ میں ''بادشاہ'' ہوتا ہے اور جس طرح چھوٹی بڑی سلطنتیں اور ان کے حکمران ہوتے ہیں، اسی طرح سخاوت کی بھی چھوٹی بڑی سلطنتیں ہوتی ہیں، جو اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے بندے سے خوش اور راضی ہو کر اسے عطا فرماتے ہیں۔مجھے تفصیل میں جانے کا یارا نہیں اور میں اس کی گہرائی میں جانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔غور کیجیے تو سخاوت کے مختلف معانی، مفاہیم اور پہلو آپ کے ذہن میں کھلتے جائیں گے، اگر مخلوق خدا کی خدمت کے لیے خزانے لٹانے والا سخی ہوتا ہے تو مخلوق خدا کی خدمت کے لیے اپنا جسم و جان وقف کرنے والا بھی سخی ہوتا ہے۔

رہی خوش اخلاقی، تو یاد رکھیے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا یہ قیمتی انعام انھیں ملتا ہے، جن سے رَب راضی ہوتا ہے اور نوازتا ہے۔والی اللہ کی سب سے پہلی پہچان ہی خوش اخلاقی، احترام انسانیت، مہمان نوازی، مخلوق خدا سے برتاؤ، ملائمت اور نرم گفتاری ہوتی ہے۔ہاں مجذوب اور نیم مجذوب اس سے مستثنیٰ یا بری الذمہ ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ نہ آپے میں ہوتے ہیں اور نہ ہی ہوش میں...... جنھیں اللہ سبحانہ تعالیٰ خوش اخلاقی کی نعمت سے نوازتے ہیں، وہ کسی کا دل دکھاتے اور نہ کسی کے جذبات مجروح کرتے ہیں۔ چھوٹا بڑا، خوب صورت، بدصورت اور امیر غریب سب ان کے لیے یکساں ہوتے ہیں اور سبھی سے محبت سے پیش آتے اور ایک ہی جیسا سلوک کرتے ہیں، وہ رتبہ دیکھ کر مہمان نوازی کا معیار مقرر نہیں کرتے، بل کہ سبھی کو ہم رتبہ اور یکساں سمجھتے ہیں۔غرور، گھمنڈ، احساس برتری وغیرہ خوش اخلاقی کے دشمن ہیں اور جنھیں اللہ پاک رضائے الٰہی کے تحت خوش اخلاقی عطا فرماتے ہیں، انھیں یہ روحانی امراض کبھی نہیں لگتیں، جب کہ مصلحت اور منافقت کے تحت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے والے کسی چھوٹے سے واقعے یا حرکت سے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔خوش اخلاق حضرت بلّھے شاہ کے الفاظ میں کبھی کسی کا دل نہیں ''ڈھاتا''، یعنی دل نہیں توڑتا۔حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں ان کا ایک نابینا عقیدت مند

Marfat.com

حاضر ہوا اور اپنے ساتھ بڑی محنت اور محبت سے بنایا ہوا کھانا لایا۔ اس کی خواہش تھی کہ حضرت اس کی موجودگی میں کھانا تناول فرمائیں۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے اسے کہا کہ میں کھالوں گا، لیکن عقیدت مند نے پھر بھی اپنی خواہش واپس نہ لی۔ حضرت نے اس کا دل رکھنے کے لیے کھانا کھالیا۔ وہ خوش ہو کر واپس چلا گیا، تو خادم نے یاد دلایا حضور آپ تو روزے سے تھے۔ فرمایا نفلی روزہ توڑنے کا کفارہ ادا ہو سکتا ہے، لیکن دل توڑنے کا کوئی کفارہ نہیں...... یہ خوش اخلاقی اور انسانی جذبات کے احترام کی ایسی انتہا ہے، جس تک عام انسان رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک اللہ پاک توفیق نہ دیں، البتہ ان مثالوں کو ایک آئیڈیل کی حیثیت سے ذہن میں رکھنا روشنی دکھاتا ہے۔ کوشش کرتے ہیں، خلوص نیت اور یکسوئی سے...... اللہ رحیم و کریم ہے۔ پُرخلوص دُعا اور نیک عمل کبھی ضائع نہیں جاتے...... معاف کیجیے گا میں اس موضوع سے انصاف کرنے کا بالکل اہل نہیں۔ نہ جانے گستاخ اَکھیاں کتھے جا اَڑیاں......!!

Marfat.com

قائدِ اعظم......اور قائدِ اعظم ثانی

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ کیا ہماری تاریخ میں کوئی قائداعظم ثانی تھا؟ مطلب یہ کہ کوئی حکمران قائداعظم کے مانند ملک وقوم کا درد رکھنے اور ایثار کرنے والا تھا؟ جواب آتا ہے کہ نہ کوئی اُن جیسا تھا اور شاید نہ ہی کوئی اُن جیسا ہوگا۔ میں بصیرت، ذہانت، اعلیٰ کردار اور طویل جدوجہد کی بات نہیں کررہا، میں تو فقط ایک پیمانے سے ناپ رہا ہوں کہ کیا کوئی قائداعظم کے مانند ملک وقوم کا درد اور احساس رکھتا تھا؟ مولانا شبیر عثمانی ایک نیک، مذہبی اور سچے انسان تھے۔ انھوں نے قائداعظم کو بہت قریب سے دیکھا اور اپنے اس مشاہدے کا نچوڑ قائداعظم کی وفات کے بعد ان الفاظ میں بیان کیا ''محمد علی جناح قائداعظم ہندوستان کی تاریخ میں اورنگزیب کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے''۔ لیاقت علی خان کی تربیت قائداعظم نے کی تھی، چناں چہ ان میں تو قومی درد اور احساس کے حوالے سے قائداعظم کی واضح جھلک نظر آتی ہے، لیکن لیاقت علی خان کے بعد تو پاکستان پر مغل شہزادوں کی حکومتیں نظر آتی ہیں، جو اپنی ذات، تفریح، عیش اور آرام پر قومی خزانہ پانی کی طرح بہاتے رہے، جب کہ قوم کوڑیوں کی محتاج رہی، قرضوں تلے دبتی چلی گئی، غربت اور تعلیم وصحت کے فقدان، قدرتی آفات اور مسائل کی چکی میں پستی رہی۔

یہ خیال مجھے کیوں آتا ہے؟ آپ کو یاد ہوگا کہ ایوب خان سے لے کر موجودہ حکمرانوں تک ہر حکمران کے حواری، درباری، خوشامدی اور مطلب پرست وقتاً فوقتاً لیڈروں کے لیے قائداعظم ثانی کا نعرہ لگاتے رہے ہیں اور اپنے حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انھیں خطابات کی بلندیوں پر بٹھاتے رہے ہیں۔ ایوب خان کو ڈیگال آف ایشیا، بھٹو صاحب کو فخر ایشیا، ضیاء الحق کو مردِ مومن مردِ حق، بینظیر بھٹو کو دختر مشرق اور میاں نواز شریف کو قائداعظم ثانی کے القابات سے نوازا گیا۔ خوشامد، پیشہ وارانہ نعروں اور جھوٹے

Marfat.com

قصیدوں میں اتنی تاثیر ہوتی ہے کہ ہر حکمران سچ مچ اپنے آپ کو قائداعظم ثانی سمجھنے لگتا ہے اور سچی بات کہنے والوں کو اپنا مخالف تصور کرتا ہے۔

بات بصیرت، قیادت، صلاحیت اور اہلیت کی نہیں، کیوں کہ اس میدان میں تو ہمارا کوئی حکمران بھی قائداعظم ثانی بننے کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ میں فقط قومی درد اور قومی خزانے کے تقدس کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ مختصر سے کالم میں نہ سب کچھ لکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی تمام شعبوں کا احاطہ ہو سکتا ہے، اس لیے میں فقط چند ایک باتوں پر اکتفا کروں گا اور موازنے کا کام قارئین پر چھوڑ دوں گا۔

قائداعظمؒ کے اے ڈی سی کیپٹن (بعدازاں بریگیڈیئر) نور حسین بتایا کرتے تھے کہ جب قائداعظم زندگی کے آخری ایام میں زیارت میں بیمار پڑے تھے، تو امریکا میں پاکستان کے سفیر اصفہانی صاحب ان کی عیادت کے لیے آئے۔ اصفہانی صاحب سے قائداعظمؒ کے دیرینہ تعلقات تھے اور میری معلومات کے مطابق واشنگٹن میں پاکستانی سفیر کی رہائش گاہ بھی اصفہانی صاحب نے خرید کر حکومت پاکستان کو تحفے میں دی تھی۔ اصفہانی صاحب نے گفتگو کے دوران قائداعظم کو علاج کے لیے امریکا آنے کا مشورہ دیا۔ قائداعظم کا جواب مختصر تھا۔ میں اپنے غریب ملک کے خزانے پر اس خرچ کا بوجھ نہیں ڈال سکتا۔ قائداعظم کے معالج کرنل الٰہی بخش نے لاہور سے ایک باورچی منگوایا، جس کا پکایا ہوا کھانا قائداعظم نے رغبت سے کھایا، جب پتا چلا کہ باورچی خاص طور پر لاہور سے منگوایا گیا ہے، تو فوراً چیک بک منگوائی اور اس کا سارا خرچہ خود ادا کر دیا تاکہ قومی خزانے پر معمولی سا بوجھ بھی نہ پڑے۔ مارچ 1948ء میں بہ حیثیت گورنر جنرل قائداعظم نے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کا ارادہ کیا۔ دورے کی فائل نیچے آئی تو ان کی صحت کے پیش نظر یہ تجویز کیا گیا کہ قائداعظم کے آرام دہ دورے کے لیے برٹش ایرویز کا طیارہ چارٹر کر لیا جائے، جس پر شاید کوئی پانچ ہزار پونڈ صرف ہوں گے۔ قائداعظم نے جواب دیا کہ میرے ملک کا خزانہ اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں گورنر جنرل کے چھوٹے سے طیارے میں ہی جاؤں گا۔ ایندھن لینے کے لیے طیارے کو ڈھاکا جاتے ہوئے، دہلی میں اتارنا پڑتا تھا، جو قائداعظم کو گوارا نہیں تھا، چناں چہ طیارے کے ساتھ مزید فیول کے لیے دوسرا ٹینک نصب کیا گیا اور قائداعظم ایک اڑان میں ڈھاکا پہنچ گئے۔ ایک عینی شاہد نے لکھا ہے کہ جب وہ طیارے سے نکلے تو ہانپ رہے تھے، کیوں کہ چھوٹا سا طیارہ ہوا میں نیچے اوپر زخمی پرندے کے مانند پھڑ پھڑاتا تھا۔ ایک بار اے ڈی سی نے قائداعظم کے سامنے ایک ملاقاتی کا وزٹنگ کارڈ لا کر رکھا، جس پر نام کے ساتھ لکھا تھا ''برادر آف قائداعظم محمد علی جناح'' قائداعظم نے اپنے قلم سے وزٹنگ کارڈ پر نام کے علاوہ سب

Marfat.com

کچھ کاٹ دیا اور اے ڈی سی سے کہا کہ اسے کہیں اپنے نام کے ساتھ میرا حوالہ ہرگز نہ لکھے اور ملاقات کے لیے وقت لے کر آئے۔ میں Appiontment کے بغیر نہیں مل سکتا۔ اتنا سا تبصرہ کافی ہے کہ قائداعظم ثانیوں نے اقربا پروری کے نئے نئے ریکارڈ قائم کیے، رشتے داروں کو سرکاری عہدوں پر بٹھایا اور اقتدار میں شامل کیے رکھا، پھر بھی قائداعظم کی ہمسری کے دعوے کرتے رہے۔ کیا آپ کو تفصیلات یاد کرانے کی ضرورت ہے؟

یہ صرف ایک حکمران کا رونا نہیں گزشتہ چھ دہائیوں سے سبھی حکمران قومی خزانے کو عیاشی اور غیرملکی دوروں پر بے دردی سے استعمال کرتے رہے ہیں۔ انھیں ہرگز احساس ہی نہیں تھا کہ وہ جس ملک کی نمایندگی کرتے ہیں، اس کے عوام صاف پانی، تعلیم، علاج معالجے، احساس تحفظ، انصاف اور زندگی کی بنیادی ضروریات کو ترستے ہیں۔ ان کا انداز حکمرانی مغل شہزادوں جیسا اور خزانے سے سلوک دشمن کے خزانے جیسا رہا۔ آج کل نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کا بڑا تذکرہ ہے۔ محترمہ بینظیر بھٹو وزیراعظم تھیں، تو پی آئی اے کے چارٹرڈ طیارے سے بہت بڑا وفد لے کر گئیں، غریب قوم کو کروڑوں روپوں کا خرچ برداشت کرنا پڑا، جب کہ ملائیشیا کا سابق وزیراعظم مہاتیر اُسی اجلاس میں شرکت کے لیے اپنے ملٹری سیکرٹری کے ساتھ ایک عام کمرشل فلائٹ سے آیا اور درمیانے درجے کے ہوٹل میں ٹھہرا۔ محترمہ کے وفد کے لیے جو کاریں کرائے پر لی گئیں ان کا بل لاکھوں ڈالروں میں تھا۔ اب ہمارے محبوب وزیراعظم جناب میاں نواز شریف صاحب امریکا گئے ہیں، تو ایک اندازے کے مطابق اس دورے پر تقریباً آٹھ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ صرف پی آئی اے کے طیارے کے لاجسٹک اور انتظامی اخراجات کے لیے چار کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ وزیراعظم صاحب کے کمرے کا روزانہ کرایہ ساڑھے سات لاکھ روپے بتایا جاتا ہے۔ گزشتہ بار جب میاں صاحب جنرل اسمبلی کے اجلاس میں تقریر کرنے گئے، تو ان کے ہفت روزہ دورے پر آٹھ کروڑ روپوں سے زیادہ صرف ہوئے۔ ہوٹل میں جو ڈنر دیا گیا، اس کا بل صرف چار لاکھ ڈالر تھا۔ گزشتہ برس تین ماہ کے دوران وزیراعظم صاحب کے سات غیرملکی دوروں پر ملکی خزانے کو صرف 168.1 ملین کا ٹیکہ لگا، جو تقریباً پونے سولہ کروڑ روپے بنتے ہیں۔ اس سے ملک و قوم کو جو حاصل ہوا اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ قوم کا ایک حصہ سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔ لاکھوں گھر پانی میں تنکوں کے مانند بہہ گئے ہیں اور لوگ کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہیں۔ فصلیں تباہ اور جانور موت کے منہ میں جا چکے ہیں، یعنی سیلاب زدگان اپنے تمام اثاثوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

Marfat.com

ہماری حکومتیں کئی دہائیوں سے سیلابوں کی تباہ کاریوں کو گھٹانے کی حکمت عملی پر کام کرنے کے بجائے وسائل کو نمایشی منصوبوں، ذاتی عیاشی اور غیر ملکی دوروں پر لٹارہی ہیں۔ تعلیم اور صحت کے لیے فنڈز کا قحط ہماری بدقسمتی کی انتہا ہے اور حکمرانوں کو ان شعبوں کی زبوں حالی کا احساس تک نہیں۔ وزیراعظم کے دوروں کے لیے بجٹ میں مختص رقم چالیس لاکھ روپے روزانہ ہے۔ اسے ذرا 365 دنوں سے ضرب دیں، جب کہ پنجاب حکومت نے پچیس لاکھ سیلاب زدگان کے لیے کل 100 ملین کی امداد کا اعلان کیا ہے، جو دس کروڑ بنتے ہیں۔ وزیراعظم ہاؤس کے خرچ کے لیے بجٹ میں 77 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ گزشتہ دنوں آپ نے پارلیمنٹ کا اجلاس دیکھا۔ پارلیمنٹ کا اجلاس قومی خزانے کو روزانہ دس لاکھ کا ٹیکہ لگاتا ہے۔ اجلاس میں اراکین ایک دوسرے کے گندے کپڑے دھوتے رہے اور حکومت کو بچانے کی قراردادیں منظور کرتے رہے۔ کیا اجلاس میں سیلابوں کی تباہی کے لیے حکمت عملی بنانے اور دوسرے عوامی مسائل کا ذکر ہوا؟ کیا اراکین نے عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی؟ اُدھر پارلیمنٹ کے باہر دھرنوں والے نئے ریکارڈ قائم کرنے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ اے کاش کوئی انھیں سمجھائے کہ تمھارے احتجاج کا پیغام قوم کو پہنچ چکا ہے۔ اب بس کرو بس۔ اے کاش کوئی حکمرانوں کے چمچوں کو بھی سمجھائے کہ ان سیاسی نونہالوں کو قائداعظم ثانی کا خطاب دے کر قائداعظم کی شان میں گستاخی نہ کریں۔ ہماری تاریخ میں ایک ہی قائداعظم تھا اور پھر ان کے بعد نہ ان کا کوئی ''ثانی'' پیدا ہوا اور نہ ہی ہوگا۔

Marfat.com

بدقسمت عہد — حضرت اویس قرنیؓ کے مزار پر حملہ

صدمے کی چادر اوڑھے، میں سوچ رہا تھا کہ ہم کس قدر بدقسمت عہد میں زندہ ہیں، جس عہد میں اپنے نبیؐ سے محبت وعقیدت کے تقاضے پورے نہ ہوں، وہ بدقسمت عہد ہی تو ہوتا ہے، کیوں کہ ہمارا مسلمان ہونا اور ہماری مسلمانی بھی نبی کریمؐ کی مرہون منت ہے، جن کے ذریعے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور مکمل دین ہم تک پہنچا۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حب رسولؐ کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی اور حب رسولؐ ہی کا تقاضا ہے کہ حضورؐ کے خاندان اور اہل بیت سے محبت بھی کی جائے اور ان کا نام یا ذکر بھی نہایت ادب سے کیا جائے۔ سچ یہ ہے کہ ہمارے مذہب، دین، حب الٰہی اور حب رسولؐ میں ادب کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو عمارت میں بنیاد کو حاصل ہوتی ہے، اس لیے جب ادب کی حدود کو عبور کیا جائے، تو ایمان کے ستون لرزنے لگتے ہیں۔ میں نے فقط بنیادی تقاضوں کے حوالے سے صرف ''حُب'' کی بات کی ہے، کیوں کہ عشق اس سے اگلی منزل ہے، جو صرف خوش قسمت لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ حب رسول، حب الٰہی ایمان کا تقاضا ہے، لیکن عشق رسولؐ اور عشق الٰہی وہ نایاب تحفے ہیں، جو بڑی محنت، خضوع وخشوع، ذکر اذکار اور عبادت سے نصیب ہوتے ہیں، کیوں کہ اسی راہ پر چلنے سے اپنے خالق اور اس کے حبیبؐ سے خصوصی تعلق کی راہیں استوار رہتی ہیں، باطن منور ہوتا ہے، آنکھوں سے پردے ہٹتے ہیں اور کائنات کے راز قلب ونگاہ کی کائنات میں فاش ہوتے ہیں۔ عشق روحانی سفر کا نقطہ آغاز ہے اور عشق کی روشنی حاصل کیے بغیر انسان روحانی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا، اسی لیے میں عشق کو ادب کی انتہا سمجھتا ہوں اور اگر ادب کے تقاضے ملحوظ خاطر نہ رہیں، تو عشق کی منزلیں طے نہیں ہوتیں۔ غزوہ احد میں حضور نبی کریمؐ کا دانت مبارک شہید ہوگیا۔ خبر سفر طے کرتے کرتے حضرت اویس قرنیؓ کے کانوں تک پہنچی۔ آپ

Marfat.com

صدمے سے نڈھال ہو گئے اور عشق رسول کے جنون میں اپنے سارے دانت توڑ ڈالے کہ نہ جانے محبوبؐ کا کون سا دانت شہید ہوا ہے۔ چاہتے تو صرف ایک دانت توڑ کر عشق کے تقاضے پورے کر لیتے، لیکن حضرت اویس قرنیؓ تو سرتاپا عاشق رسولؐ تھے، ان کے رگ و پے میں عشق سمایا ہوا تھا اور اس عشق نے جذب کی ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی، جس میں سوچ کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ سود و زیاں کا معاملہ نہیں رہتا۔ عشق بلاخطر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے۔ حضرت اویس قرنیؓ نے خبر سنتے ہی بے اختیار ایک دانت توڑ ڈالا کہ حضورؐ کا دانت مبارک شہید ہوا تھا، پھر خیال آیا کہ نہ جانے کون سا اور پھر اسی لگن کی انتہا میں سارے دانت توڑ ڈالے۔ ذرا غور کیجیے دانت توڑنا کتنا دردناک، تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ دانت میں معمولی درد ہو تو رات بھر نیند نہیں آتی، کھانا پینا مشکل ہو جاتا، لیکن خود دانت توڑنا۔ انسان تصور ہی سے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور ہمت جواب دے جاتی ہے، لیکن عشق میں درد کی لذت ہی کچھ اور لذت ہوتی ہے، کیوں کہ عشق ادب کے ساتھ ساتھ ایثار بھی مانگتا ہے۔ ایثار ادب ہی کا شاخسانہ ہے، پھر عاشق الٰہی اور عاشق رسولؐ کو اتنی ہوش یا شعور ہی کہاں ہوتا ہے کہ وہ درد کا حساب لگانے لگیں۔ ہوش اور شعور پر تو عشق کا غلبہ ہوتا ہے اور اس غلبے سے درد لذت بن جاتا ہے۔

عشق کی انتہا کے بغیر محبوب کے دل میں جگہ نہیں ملتی اور اگر یہ جگہ مل جائے، تو پھر عاشق کے سامنے زمین و آسمان ہیچ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی اسی عشق کی انتہا کا کرشمہ تھا کہ حضور نبی کریمؐ نے روئے مبارک حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی طرف کر کے فرمایا تھا جب اس (حضرت اویس قرنیؓ) سے ملو تو میرا سلام کہنا اور اس سے کہنا کہ میری امت کے حق میں دعا کریں۔ اللہ اللہ۔ یہ مقام کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا کہ حضورؐ نے اپنی امت کے لیے دعا کرنے کا اعزاز بخشا ہو۔ حضور نبی کریمؐ کو اپنی امت سے حد درجہ پیار تھا۔ اسی پیار کے صدقے وہ اپنی امت کی بخشش کے لیے فکر مند اور دعا گو رہتے تھے، اللہ سبحانہ تعالیٰ سے امت کے لیے آسانیاں، رحمتیں اور برکتیں مانگتے رہتے تھے اور اسی پیار کا کرشمہ تھا کہ حضور نبی کریمؐ نے حضرت اویس قرنیؓ کو امت کے لیے دعا کا پیغام بھیجا۔ دوستو ذرا غور کرو کہ جس ہستی سے حضور نبی کریمؐ خود دعا کے لیے کہیں۔ وہ کیا ہستی ہو گی؟ اس کا اللہ سبحانہ تعالیٰ کے دربار میں کیا مقام ہو گا؟ اور پھر ہم کتنے بدقسمت عہد میں زندہ ہیں کہ اس عظیم ہستی کے مزار پر بموں سے حملہ کیا گیا اور عمارت کو نقصان پہنچایا گیا۔ اس سے ملحق مسجد...... خانہ خدا...... کو بھی دھماکوں سے نقصان پہنچایا گیا اور مسجد کا ایک حصہ شہید ہو گیا۔ آپ نے بھی یہ خبر اخبارات میں پڑھی ہو گی اور آپ کو علم ہو گا کہ حضرت اویس قرنیؓ کا مزار ملک شام میں

Marfat.com

واقع ہے۔ دہشت گردی نے ادب کی حدیں پامال کر دیں۔ کچھ عرصہ قبل حضرت زینبؓ کا مزار مبارک دہشت گردی کا نشانہ بنا، پھر خبر آئی کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے مزار پر حملہ ہوا اور ساتھ ہی خبر آئی کہ عظیم ترین عاشق رسول حضرت اویس قرنیؓ کے مزار کا کچھ حصہ شہید کر دیا۔ جہاں نبی کریمؐ کی نواسی حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کی بیٹی اور تاریخ اسلام کی عظیم ہستی، جرات، بہادری، صبر، رضائے الٰہی اور استقلال کی مثال حضرت زینبؓ کا احترام ملحوظ خاطر نہ ہو، وہاں کسی اور کے احترام کی توقع عبث......!! اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ہم بدقسمت عہد میں زندہ ہیں۔ یہ عہد بدقسمت ہے، جس میں خانوادہ رسول اللہؐ سے لے کر مجاہدین اور عاشقان رسول تک کے ادب کو لہولہان کیا جا رہا ہے۔

یادش بخیر۔ میں احد کے میدان میں حضرت امیر حمزہؓ کے مزار کے قریب کھڑا تھا اور میرے ساتھ مدینہ منورہ کی ایک نیک شخصیت تھیں۔ حضور نبی کریمؐ کو اپنے چچا حضرت امیر حمزہؓ، شہید جنگ احد...... سے بہت پیار تھا۔ میرے ساتھ کھڑے شخص نے زمین پر اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ مقام ہے، جہاں حضورؐ کے دانت مبارک شہید ہوئے۔ کسی نے وہاں سرخ نشان لگا دیا تھا۔ کہنے لگے گزشتہ سال ہندوستان سے ایک روحانی شخصیت یہاں آئی تھی، انھوں نے مراقبہ کر کے کشف کے ذریعے یہ مقام دریافت کیا تھا۔ میں نے اس مقام کو ہاتھ سے بوسہ دیا اور پھر ہاتھ چوم لیا۔ اگلی بار وہ جگہ ڈھونڈھنے کی سر توڑ کوششیں کی، نہ ڈھونڈھ سکا، میں اس قابل نہ تھا۔ آج تک دل میں قلق ہے کہ جھک کر زمین پر اس مقام کو بوسہ کیوں نہ دیا؟ ہاتھ لگا کر چومنا خام محبت اور سطحی عقیدت کی علامت ہے۔ جن کو عشق ہوتا ہے، وہ سوچتے نہیں، بے اختیار کر گزرتے ہیں۔ ذکر ہو رہا تھا حضرت اویس قرنیؓ کا۔ کتنے خوش قسمت تھے کہ ان سے حضور نبی کریمؐ کو غائبانہ محبت تھی۔ حضرت سید علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش نے اپنی زندہ عظیم کتاب ''کشف المحجوب'' میں لکھا ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا کہ قرنی میں اویس نامی ایک شخص ہے، جسے قیامت کے روز قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کے بالوں کی تعداد کے برابر میری اُمت کے لوگوں کی شفاعت کا حق ہوگا۔ حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت میں حضرت علیؓ کے ساتھ مکہ معظمہ آئے، تو اپنے خطبہ میں فرمایا اے اہل نجد! کھڑے ہو جاؤ۔ ان سے پوچھا تمھارے اندر کوئی قرنی کا آدمی ہے؟ قرن کے لوگ آگے آئے تو اویس کے بارے میں پوچھا انھوں نے بتایا اویس نامی ایک دیوانہ ہے، جو جنگل میں اونٹوں کے پاس رہتا ہے، غم اور خوشی کو بھی نہیں جانتا، بل کہ جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے اور جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ان کے پاس پہنچے تو حضرت اویس قرنیؓ

Marfat.com

نماز میں مصروف تھے۔ فارغ ہوئے ،تو ان بزرگوں کو سلام کیا اور اپنے ہاتھ اور پہلو کے وہ نشان دکھائے ، جن کا ذکر حضورؐ نے اپنے صحابہ سے کیا تھا تا کہ وہ انھیں پہچان لیں ۔ گویا حضرت اویس قرنیؓ کو علم تھا کہ حضور نبی کریمؐ نے اپنے صحابہ کو ان کی نشانات بتائی تھیں ۔ ان عظیم حضرات نے حضرت اویس قرنیؓ کو حضور نبی کریمؐ کا پیغام دیا۔ ضروری باتیں ہوگئیں تو حضرت اویس قرنیؓ نے فرمایا۔ آپ حضرات کو تکلیف ہوئی۔ اب واپس جاؤ قیامت قریب آگئی ہے اس وقت ہمیں وہ دیدار ہوگا جو کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اب میں قیامت کے راستے کا توشہ تیار کرنے میں مشغول ہوتا ہوں ۔ اہل قرن پر اس دیوانے کی حقیقت کا راز فاش ہوا، تو وہ ان کی بہت قدر و منزلت کرنے لگے، جو حضرت اویس قرنیؓ کو گوارہ نہ تھی، چناں چہ وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کوفے کی طرف نا معلوم مقام کی طرف چلے گئے۔ آخری دفعہ انھیں اس وقت دیکھا گیا، جب جنگ صفین میں وہ حضرت علیؓ کی طرف سے میدان جہاد میں نکلے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ سچے عاشق رسولؐ اور عاشق الٰہی کی زندگی ہی شہید کی زندگی ہوتی ہے، کیوں کہ سچا عاشق ،یعنی عشق حقیقی شہادت کی رزم گاہ کا مسافر ہوتا ہے۔

دوستو! ان معصوم ہستیوں، مادرزاد اولیاے کرام اور عاشقان کو ہر لمحہ آخرت کے توشے کی فکر رہتی تھی اور رہتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم آخرت کے توشے سے بے فکر اور بے نیاز ہوکر ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔

Marfat.com

مرشد

بزرگ کہتے ہیں کہ دل کی بات خوشبو کے مانند ہوتی ہے، اسے دل ہی میں رکھا جائے، تو بہتر ہے۔ کچھ یہی حال ان تجربات کا ہوتا ہے، جن کا تعلق آپ کے قلب یا روح سے ہو۔ اسے عام الفاظ میں قلبی واردات کہتے ہیں، جسے انسان محسوس کرتا ہے، تجربے سے گزرتا ہے، کبھی کبھی دیکھتا بھی ہے، لیکن عام طور پر اظہار کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ میں اپنے طور پر محسوس کرتا ہوں کہ اگر آپ کے بیان سے کسی کی راہنمائی ہوتی ہو یا روحانی تشنگی کم ہوتی ہو، تو اسے بیان کرنے میں کیا حرج ہے؟ کیوں کہ ایسے بیان سے کوئی دنیاوی مفاد ہرگز وابستہ نہیں ہوتا۔ اللہ پاک دنیاوی حرص اور مفادات سے دُور رکھیں۔

طویل عرصہ قبل میں نے ایک کالم لکھا تھا، جس کا عنوان تھا ''مرشد''......اس کالم میں مرشد اور مرشد کامل دونوں اصطلاحیں استعمال ہوئی تھیں، چناں چہ اس حوالے سے بہت سے قارئین نے پوچھا کہ کیا مرشد اور مرشدِ کامل میں فرق ہوتا ہے؟ فرق ہوتا ہے، تو کیا؟ اب میرا معاملہ کچھ یوں ہے کہ میں نے ''کشف المحجوب'' اور سید سرفراز شاہ صاحب کی تین کتابوں کے علاوہ فقر اور روحانیت پر لٹریچر کا نہ مطالعہ کیا ہے اور نہ ہی عظیم اور نام ور اولیاے کرام کی زندگیوں یا کرامات کے بارے میں کچھ پڑھا ہے۔ میں جب لکھتا ہوں تو ٹوٹے پھوٹے اور ادھورے تجربات کی روشنی میں اپنے محسوسات، مشاہدات اور اخذ کردہ نتائج بیان کرتا ہوں۔ میں کیا اور میرے تجربات کیا؟ میں ایک نہایت گناہ گار اور خطا کار انسان ہوں، جس کے قلب پر تاریکی کی تہیں جمی ہوئی ہیں اور آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ محض میرے رَبّ کا کرم اور میرے پروردگار کی نعمت تھی کہ مجھے چند ایک ایسے اولیاے کرام سے ملنے، ان کی جوتیوں میں بیٹھنے اور انھیں دیکھنے کا موقع ملا، جن میں ہر کوئی میرے نزدیک ولی کامل تھے اور جن کا

Marfat.com

انتقال یا وصال ہوئے طویل عرصہ گزرا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ہم اولیاے اکرام یا عظیم ہستیوں سے ملتے ہیں، تو از راہ عقیدت اسے جوتیوں میں بٹھنا کہتے ہیں، حالاں کہ جن ہستیوں سے مجھے ملنے اور سیکھنے کا موقع ملا، وہ سب پیار سے اپنے پاس بٹھاتے تھے، اکثر جوتیوں کے بجاے کرسی پر بٹھاتے تھے اور ان میں سے ایک سے تو دوستی یا یارانہ تھا جو دو دہائیوں پر پھیل گیا۔ ان کے رعب و داب کا یہ عالم تھا کہ کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہم لوگ مارے ادب کے سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے، جب کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ سر کبھی کسی حاکم کے سامنے نہیں جھکا، فقیروں کی محفل میں یہ سر اُٹھتا ہی نہ تھا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ کسی ولی کامل کو کیسے ڈھونڈیں۔ میرا تجربہ ہے، اگر جستجو، خواہش اور آرزو سچی ہو، خلوص اور استقامت پر مبنی ہو، تو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ خود راستہ اور ذریعہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس معاملے کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، کیوں کہ مجھے بغیر کسی تجربے اور مشاہدے کے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے جن اشخاص کی کوئی روحانی نسبت ہوتی ہے اور جن کے پس پردہ کوئی دُعا یا نگاہ ہوتی ہے، ان کے لیے راستے بنتے اور کھلتے چلے جاتے ہیں اور حالات کی کڑیاں جڑتی چلی جاتی ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے اکثر اوقات کسی اولیا کی دُعا یا نگاہ کا انسان کو خود بھی علم نہیں ہوتا، خاص طور پر جب صاحب نگاہ دنیا میں موجود نہ ہو۔ انسان کو اپنی روحانی نسبت کا بھی علم نہیں ہوتا، جب تک کوئی ولی کامل اس راز سے پردہ نہ اُٹھا دے۔ یہ ایک ایسا معاملہ اور شعبہ ہے، جو ہماری سمجھ سے بالاتر اور ہماری نگاہ سے اوجھل رہتا ہے اور کوشش سے بھی سمجھ نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ زندگی کی سٹیج پر آپ کو محض موہوم سا احساس ہوتا ہے یا خیال آتا ہے کہ کوئی دُعا تھی، کوئی نگاہ تھی، جو عمر بھر ساتھ ساتھ چلتی رہی اور سنگلاخ وادیوں میں راستے بناتی رہی۔

یہ میری ذاتی رائے یا احساس ہے، جس کی بنیاد کسی کتابی مطالعے یا مشاہدے پر نہیں، اگر آپ کی آرزو سچی ہو، لگن مخلص ہو اور کسی کی دُعا یا نگاہ کا سایہ آپ کے سر پر ہو تو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ اولیاے کرام سے ملا دیتے ہیں، کسی ولی کامل کی زیارت کرا دیتے ہیں اور یوں آپ کا روحانی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب آپ ایسی ہستی کی سرکار یا محفل میں پہلی بار حاضری دیتے ہیں، تو آپ کا یوں استقبال ہوتا ہے، جیسے آپ اس محفل کا دیرینہ حصہ ہیں، آپ یہاں مدتوں سے آ رہے ہیں، نہ اجنبیت نہ خوف...... دراصل ''اُن'' کی نگاہ اس روحانی نسبت یا ''حوالے'' یا ''دعا'' یا ''نگاہ'' پر ہوتی ہے جو آپ کی شخصیت سے وابستہ ہو کر آپ کے سینے میں روشنی کی کرن پیدا کر دیتی ہے، لیکن وہ کبھی بھی اس راز سے پردہ اٹھاتے نہیں، نہ اس کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اس حوالے کے احترام کے سبب آپ کو اپنے حلقے میں دیرینہ ساتھیوں کے مانند جگہ دے

Marfat.com

دیتے ہیں، جب کہ آپ کی نگاہوں کے سامنے دوسرے اجنبی حضرات یا حاضر ہونے والے عقیدت مندوں کا اس طرح استقبال نہیں ہوتا۔ اب اس میں بھی ایک راز ہے، جو میں دیکھ تو نہیں سکتا لیکن محسوس کرتا رہا ہوں۔ دراصل ولی اللہ یا اولیا کرام کی نگاہ آنے والے شخص کے قلب پر ہوتی ہے، جو لوگ خالصتاً کسی دنیاوی حاجت یا مادی ضرورت کے لیے آتے ہیں، ان کو قرب کا مقام نہیں ملتا، نہ اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ بس دُعا کی اور رُخصت کر دیا۔ اللہ پاک جانیں اور ان کی مخلوق جانے، جو لوگ خلوص نیت سے روحانی راہنمائی یا روحانی فیض کے لیے آتے ہیں۔ ان کو جانچا پرکھا جاتا ہے، ان کے ظرف، قلبی ماہیت اور برداشت کا امتحان لیا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے خلوص کو امتحانات کے مشکل راستوں سے گزارا جاتا ہے۔ یہ دراصل آپ کی آرزو کی استقامت کا امتحان ہوتا ہے، اگر آپ کی آرزو مخلص اور مستحکم ہے اور محض وقتی یا عارضی جذبہ نہیں تو آپ ولی اللہ کے در پر بیٹھے رہتے ہیں، بعض اوقات سختیوں اور مشکلات کے باوجود ڈٹے رہتے ہیں، تو پھر آپ کو کچھ نہ کچھ، اپنے اپنے ظرف کے مطابق مل ہی جاتا ہے۔ میں نے بہت بڑی اکثریت کو جلدی میں پایا اور وہ محروم رہی ہے۔ روحانی دنیا میں جلد بازی خودکشی کے مترادف ہوتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ جلد از جلد ولی اللہ کی کرامت کے مشاہدے کے لیے بے چین تھے اور تھوڑے عرصے میں روحانی فیض کے حصول کی تمنا رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ ناکام رہے اور نامراد لوٹے، کیوں کہ روحانی دنیا میں کامیابی کی اولین شرائط ہی صبر، اَدب اور استقامت ہے، اگر آپ کے دل میں وسوسے جنم لینے لگے، آپ وہ شے مانگنے لگے، جس کے آپ مستحق نہیں، تو پھر کچھ بھی نہیں ملے گا، کیوں کہ اس میدان میں حق اور استحقاق ریاضت، محنت اور مستقل مزاجی سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو میں نے جلد روحانی فیض حاصل ہوتے بھی دیکھا۔ شاید اس لیے کہ ان کے باطن کی زمین فصل بونے کے لیے پہلے ہی تیار تھی، پھل پک چکا تھا، صرف ان کی جھولی میں گرنے کی دیر تھی۔ کچھ کو میں نے دیکھا کہ انھیں کسی اور جگہ بھیج دیا گیا کہ آپ کا حصہ وہاں ہے۔ میں اندھا، جنم جنم کا اندھا کیا جانوں کہ کیا یہ سلسلہ اور ماجرا تھا۔ ایک ہمدم دیرینہ کو ایسا ہی حکم ہوا۔ فلاں جگہ پہ چلے جاؤ، تمھارا حصہ وہاں ہے۔ یہ حصہ کیا ہوتا ہے اور کہاں ہوتا ہے؟ میں جاہل کچھ نہیں جانتا۔ طویل عرصے کے بعد راز و نیاز کے دوران اس ہمدم دیرینہ سے پوچھا، جہاں تمھیں بھیجا گیا تھا، وہاں سے کچھ ملا؟ اس نے نہایت اطمینان اور راز کے لہجے میں بتایا کہ ہاں تھوڑی سی ریاضت کے بعد مل گیا تھا۔ یہ وہ معاملات ہیں اور احوال ہیں، جو ہمیں نظر نہیں آتے، لیکن روحانی دنیا میں یقین بھی استقامت کا حصہ ہوتا ہے، اگر آپ کا یقین ''ڈھل مل'' متزلزل یا ڈگمگا رہا ہے، تو یقین رکھیے کچھ نہیں ملے گا۔

Marfat.com

خزاں میں بہار

آپ نے یقیناً وہ محاورہ سن رکھا ہوگا کہ ''اولڈ از گولڈ'' یعنی پرانی چیزیں ہیرے اور سونے کے مانند ہوتی ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہر پرانی شے سونا اور ہیرا نہیں ہوتی۔ یہ فقرہ لکھ چکا ہوں، تو مجھے اپنے گاؤں کا چاچا طالب یاد آ رہا ہے، جسے لوگ چاچا ''لالہ'' کے نام سے پکارتے تھے۔ والدین کس قدر لاڈ پیار سے نام رکھتے ہیں اور اس نام میں اپنے کتنے ہی خوابوں کو سموتے ہیں، لیکن نام بگاڑنے والے اور روز مرہ کے سانچے میں ڈھالنے والے بڑے ظالم ہوتے ہیں، وہ نام کو رواں بنانے کے لیے اس کا کچومر نکال دیتے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، جس طرح ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہوتی، اسی طرح ہر پرانی شے بھی سونا ہیرا نہیں ہوتی۔ میرے استاد پروفیسر دلاور حسین (مرحوم) ایم اے او کالج لاہور کے پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ شعبہ سیاسیات پنجاب یونیورسٹی میں پڑھایا کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب اپنی حاضر جوابی بذلہ سنجی اور حس مزاح کے لیے خاصے مشہور تھے، چناں چہ وہ ہیرا انسان تھے۔ ایک دن کلاس میں آئے تو چہرے پر مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ ہم نے اس جاسوس قسم کی شریر مسکراہٹ کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے ''میرا بیٹا میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ میں اسے ہر روز کچھ انگریزی یاد کرنے لیے دیتا ہوں اور اگلی صبح ناشتے پر سنتا ہوں۔ آج میں نے اس سے محاورے سنتے ہوئے کہا کہ (NECESSARY EVIL) یعنی بلائے ناگہانی یا ناگزیر مصیبت کو فقرے میں استعمال کرو۔ اس نے ایک آدھ منٹ سوچا اور بولا ''جوان بچوں والی بوڑھی عورت ناگزیر مصیبت ہوتی ہے'' (An Old Woman with Grown up Children is a Necessary Evil) دراصل انگریزی میں اس فقرے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ پروفیسر صاحب نے بتایا کہ جب انھوں نے اپنے بیٹے کی زبان سے یہ فقرہ سنا تو سامنے پراٹھے پکاتی ہوئی اپنی بیگم کو آواز دی کہ

Marfat.com

ذرا ادھر آؤ اور سنو تمھارا چاند تمھیں کیا کہہ رہا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ پروفیسر صاحب کا یہ بیٹا مقابلے کا امتحان پاس کر کے پولیس افسر بنا اور شاید آئی جی ریٹائرڈ ہوا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہر پرانی شے ہیرا سونا نہیں ہوتی۔ ہمارے معاشرے میں بوڑھا۔ وہ عورت ہو یا مرد۔ زنگ آلود لوہے کے مانند ہوتا ہے، جو نہ اپنے کام کا اور نہ ہی گھر والوں کے کام کا، چناں چہ عام طور پر اسے ''ضروری مصیبت'' سمجھ کر ہی گوارہ کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی ایک خیر کا پہلو ہے کہ اسے فروخت نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ ردی خریدنے والے بھی زنگ آلود لوہے کا کچھ نہیں دیتے، اگر وہ سونے یا ہیرے جیسا قیمتی ہوتا تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ مغرب نے تو اس کا علاج یہ ڈھونڈا ہے کہ بوڑھوں کے لیے اولڈ ہومز بنا دیے ہیں، جہاں وہ سرکاری مہمان بن کر رہتے ہیں۔ ان کے لیے بس اور ٹرین کا سفر مفت ہوتا ہے، چناں چہ جب تک ان کے گوڈوں گٹوں میں ہمت ہوتی ہے، وہ جی بھر کر سفر کرتے اور بے فکری کی زندگی گزارتے ہیں۔ علاج معالجے کی بھی فکر نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ ذمہ داری بھی سرکار نے اپنے سر لی ہوتی ہے۔ آکسفورڈ میں ایک ایسے ہی پاکستانی برطانوی بوڑھے سے میری ملاقات رہتی تھی۔ وہ مجھے بتایا کرتا تھا کہ میں نے دراصل برطانیہ سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ بوڑھے ہونے کے بعد دیکھے، جب میں فارغ تھا اور مفت سفر کی سہولت میسر تھی، ورنہ تو جوانی مشین کے مانند کام کرتے گزر گئی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ یہ معاشرہ بڑا احسابی کتابی ہے۔ میں نے جو عمر بھر ٹیکس اور سوشل سکیورٹی دی اب بڑھاپے میں وہ کھا رہا ہوں۔ اس کے برعکس پاکستانی معاشرہ منافقت کا شکار ہے۔ وہ اولڈ ہومز میں بزرگوں کو بھجوانا مشرقی روایات کی توہین سمجھتے ہیں، جب کہ گھروں میں ''بہویں'' بوڑھے کی بے وقت کھانسی کے خلاف احتجاج کر کے خاوند کے ''کان کھا'' لیتی ہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب وہ بڈھے یا بڈھی سے نجات کی دعائیں مانگتے ہیں، لیکن ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں، چناں چہ سزا کا یہ سلسلہ دونوں جانب طویل ہوتا رہتا ہے، جن کی اولاد بیویوں کی جھک جھک سے تنگ آ کر بڈھوں کو اولڈ ہومز میں جمع کروا آتی ہے، پھر وہ عید بقر عید پر بھی واپس مڑ کر نہیں دیکھتے کہ کہیں بڈھا بلائے ناگہانی کے مانند گلے نہ پڑ جائے۔

بڈھوں کو وقت بے وقت کھنگورا مارنے، بیمار پڑنے اور فالتو وقت دستیاب ہونے کے سبب ہر بات میں دخل دینے کی عادت ہوتی ہے، اس لیے ہمارے معاشرے میں عام طور پر بوڑھوں کو گھر میں ہی الگ کر دیتے ہیں تاکہ بچے ان کا زلزلہ نما کھنگورا سن کر نہ ڈریں۔ پنجاب کے دیہاتوں میں صدیوں سے رواج ہے کہ بڈھوں کو بیٹھک میں سجا دیتے ہیں تاکہ وہ گلی سے گزرنے والوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ

Marfat.com

کرتے وقت گزارتے ہیں، جب تک یہ حضرات جوان تھے اور کماتے تھے، تو خاندان کا انحصار ان کے زور بازو پر تھا، گھر بار میں ان کا بڑا رعب اور دبدبا ہوتا تھا۔ وہ گھر کے صحن میں قدم رکھتے تو بہویں فوراً سر پر دوپٹے کھینچ لیتیں اور بچے مارے ادب اور خوف کے اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ جب وہ کمانے کے لائق نہیں، تو وہ خاندان پر بوجھ بن گئے۔ یہی زندگی ہے، اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ '' ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات''۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ میں جب بھی یہ محاورہ سنتا ہوں کہ ''اولڈ از گولڈ'' یعنی پرانی شے سونا ہوتی ہے، تو مجھے اپنے گاؤں کا چاچا طالب عرف چالا طالا یاد آ جاتا ہے۔ ہم بچپن میں بستے اُٹھا کر سکول جاتے ہوئے، گلی میں ایک چارپائی پر بیٹھے حقہ پیتے بزرگ کو دیکھتے تھے، جو موسم کے مطابق رنگ بدلتا رہتا تھا۔ گرمی ہوتی تو وہ قمیصیں اُتار کر صرف دھوتی پہنے ملتا، کیوں کہ بوڑھے ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خود بوڑھا اور محلے والے اس کے لباس سے آزاد ہو جاتے ہیں، ورنہ تو جوان آدمی صرف مختصر سی دھوتی پہنے گلی میں بیٹھا ہو تو گاؤں کی بہو بیٹیاں اس طرف سے گزرتی نہیں اور بعض اوقات لوگ ڈنڈے پکڑے اسے سبق سکھانے اور سمجھانے آ جاتے ہیں۔ کھلنڈری بے پروا عمر تھی، ہم چاچے کی چارپائی کے قریب سے گزرتے، تو اسے چھیڑنے کے لیے پوچھتے ''چاچا مرنائیں''۔ چاچا بذلہ سنج اور ہنس مکھ تھا۔ مسکراتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسکرا کر جواب دیتا ''پترا جب سے چاچے کو مرتا دیکھا ہے موت سے میرا دل ''چڑھ'' گیا ہے۔ یعنی موت سے دل بھر گیا ہے۔ چاچا مسکراتا تو مجھے خزاں میں بہار کے مانند لگتا۔ چاچے کو اسی طرح چھیڑتے کئی برس گزر گئے، حتیٰ کہ ایک روز ہم اس گلی سے گزرے تو وہاں نہ چاچا تھا اور نہ چارپائی۔ پتا چلا چاچا کل وفات پا گیا تھا اولاد نے اسے جلدی جلدی دفن کر دیا ہے اور اس وقت اس کی چھوڑی ہوئی ''پونجی'' کی تقسیم پر جھگڑا ہو رہا ہے، کیوں کہ چاچا شہری بڈھوں کی طرح چند تصویریں بتاں اور کچھ حسینوں کے خطوط چھوڑنے کے بجائے زرخیز زرعی زمین کے چند ایکڑ اور دو کچے کوٹھے چھوڑ کر مرا تھا۔ یہی زندگی ہے، یہی زندگی کے تلخ حقائق۔

یہی زندگی کا انجام ہے، لیکن انھی تلخیوں میں مسکرا کر زندہ رہنا سیکھو کہ یہی جوان مردی ہے۔ یقین رکھیے جوان مردی عمر کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ بوڑھے مسکراتے رہیں، تو خزاں میں بہار آ جاتی ہے۔

Marfat.com

منافرت پھیلانے والوں سے ہوشیار رہو

فکری حوالے سے پاکستان کا ایک بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ پاکستان بعد میں بنا، جب کہ اس کا نظریہ یا تصور صدیوں پرانا تھا، جس کی جڑیں شاہ ولی اللہ کے خطوط سے لے کر سرسید سے ہوتے ہوئے علامہ اقبال تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان اور دیگر ممالک صدیوں پرانے ہیں، ان کا جغرافیہ، سلطنت اور حدود پھیلتی سکڑتی رہی ہیں، لیکن ان کا وجود جغرافیائی وجود ہمیشہ قائم رہا ہے۔ پاکستان 1947ء میں جغرافیائی طور پر دنیا کے نقشے پر اُبھرا، جب کہ اس کی نظریاتی اساس یا تصور صدیوں پرانا ہے۔ نوزائیدہ ملک ہونے کے سبب کئی سیاسی مکتبہ ہائے فکر پاکستان کے تصور سے بغاوت کرتے رہے ہیں اور اس کے معرض وجود میں آجانے کے باوجود دل سے اس کا وجود تسلیم کرنے سے عاری اور انکاری رہے ہیں۔ پاکستان کو باطنی اور داخلی طور پر کمزور کرنے کا آسان سانسخہ یہ ہے کہ اس کی نظریاتی اساس کو کمزور کیا جائے۔ جب بنیاد کمزور ہوگی، تو جغرافیہ اور عمارت بھی متاثر ہوگی۔ نظریاتی اساس کو کمزور کرنے کا آسان سانسخہ یہ ہے کہ کنفیوژن پیدا کر کے، شکوک وشبہات کو ہوا دے کر اور ملک کی بنیادوں پر فکری کلھاڑے چلا کر لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا کیے جائیں اور انھیں ملک کی نظریاتی بنیاد یا تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بارے میں بدظن کر دیا جائے۔ بدظن کرنے کے لیے لوگوں کے ذہنی اور فکری اتحاد میں دراڑیں یا شگاف ڈالنا ضروری ہے۔ الحمدللہ کہ پاکستان کی بہت بڑی اکثریت پاکستان کے قیام، اس کے پس منظر، محرکات اور تحریک پاکستان کے لیڈران پر نہ صرف متفق ہے، بل کہ ان پر پختہ یقین بھی رکھتی ہے۔ اس یقین کو کمزور کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ تحریک پاکستان کے روشن میناروں کی روشنی مدھم کی جائے، مسلمانوں کے متفقہ لیڈروں کو متنازع (Controversial) بنایا جائے، ان کی ذاتی زندگی کے حصار

Marfat.com

میں سرنگ لگا کر ان کا قد و قامت گھٹایا جائے، ان کے گرد تقدس کا جو ہالہ تاریخ نے بنایا ہے، اسے ٹکڑے کیا جائے تا کہ عوام کے ذہنوں میں ان قومی ہیروز، فکری راہنماؤں اور محسنوں کے بارے میں جو تقدس اور قلبی احترام کا نور پھیلا ہوا ہے، اسے گھٹایا جا سکے۔ اس تحریک کو کبھی آزادی اظہار کے لبادے میں جاری رکھا جاتا ہے، تو کبھی علاقائی تاریخ کی خدمت کے نام پر آگے بڑھایا جاتا ہے۔ اب ذرا غور کیجیے اور مجھے بتائیے کہ پاکستان کے قیام کے حوالے سے پاکستانی قوم کے نظریاتی، فکری اور سیاسی راہنما کون ہیں؟ کون سی شخصیات ہیں، جو ہماری تاریخ اور ہمارے ذہنوں میں کوہ ہمالیہ کے مانند بلند، عظیم اور مضبوط کھڑی ہیں؟ یوں تو بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں، لیکن میرے نزدیک ہماری سب سے بڑی اور عظیم ترین قومی شخصیات، قومی ہیروز اور تاریخی علامتیں علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح ہیں۔ مجھے تاریخ کے غیر جذباتی مطالعے نے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ پاکستان کی نظریاتی بنیاد علامہ اقبال نے بنائی، علامہ اقبال نے اپنے خطوط 37-1936ء بنام جناح میں نہ صرف منزل کی نشان دہی کی، بل کہ قائداعظم کو علیحدہ مسلمان مملکت کے قیام کے مطالبے پر بھی آمادہ کیا اور اس مملکت کی نظریاتی بنیاد بھی واضح کی۔ حوالے دوں تو کالم طوالت کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ آپ سے درخواست ہے کہ اقبال کے خطوط بنام جناح پڑھیں اور خط مورخہ 28 مئی 1937ء کو ذرا غور سے پڑھیں، جس میں علامہ نے جناح سے کہا ہے کہ اب مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے مطالبے کا وقت آ گیا ہے۔ اس سے قبل وہ اس مطالبے کی نظریاتی بنیاد اور تاریخی جواز پر روشنی ڈالتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اپریل 1938ء میں رحلت فرما گئے، لیکن انتقال سے قبل ان خطوط کے ذریعے قائداعظم کو قائل کر گئے کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا جائے اور اس مقصد کے لیے مسلم لیگ کا اجلاس پنجاب میں منعقد کیا جائے۔ قائداعظم کے ذہن میں اس اجلاس کے لیے اگست کا مہینہ تھا۔ علامہ اقبال نے اگست کی جس کے پیش نظر مارچ کی تجویز دی۔ یہ اجلاس علامہ کے انتقال کے دو سال بعد مارچ 1940ء میں لاہور میں منعقد ہوا، جس میں قرارداد پاکستان منظور کر کے مسلمانوں کی منزل طے کر دی گئی۔ قائداعظم جیسے سچے اور کھرے انسان نے اس موقع پر کہا کہ آج ہم نے وہی کر دکھایا جو اقبال چاہتے تھے۔ وہ زندہ ہوتے تو حد درجہ خوش ہوتے۔ اس سے زیادہ خراج تحسین قائداعظم نے ''اقبال بنام جناح خطوط'' نامی کتاب کے پیش لفظ میں پیش کیا۔ قائداعظم اقبال سے کتنا متاثر تھے اور ان کی خدمات کے کتنے معترف تھے، اس کا اندازہ قائداعظم کی ان الفاظ سے لگایئے، جو انھوں نے علامہ اقبال کی برسی کے موقع پر کہے۔ ان الفاظ میں پوشیدہ گہری عقیدت کو ذرا غور سے محسوس کیجیے۔ قائداعظم

Marfat.com

جیسے ٹھنڈے، قانونی اور ایمان دار مزاج شخصیت نے کہا اگر مجھے پاکستان اور علامہ اقبال کے کلام میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں اقبال کے کلام کو قبول کروں گا۔ پاکستان قائداعظم کا عزیز ترین خواب تھا، پاکستان قائداعظم کے دل کی دھڑکن تھی، لیکن وہ اس پر کلام اقبال کو ترجیح دیتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ کلام اقبال نے خوابیدہ قوم میں بیداری کی لہر پیدا کی، ان میں اسلامی حمیت اور مذہبی شعور بیدار کر کے علیحدہ قومیت، منفرد حیثیت اور الگ وجود کا شعور پیدا کیا، قرآنی تعلیمات کے ذریعے ان کے ایمان کو تازہ کیا اور مسلمانوں کے تاریخی کارنامے سنا کر نہ ہی صرف ان میں احساس تفاخر، قومی اعتماد پیدا کیا، بل کہ جوش و جذبے کو بھی مہمیز لگائی۔ انھی کارناموں سے مسلم لیگ عوامی مقبولیت کے درجے پر پہنچی، قائداعظم کی قیادت کو قلبی قبولیت حاصل ہوئی اور قیام پاکستان کی راہ ہموار ہوئی۔ 1930ء میں خطبہ الٰہ آباد کے موقع پر علامہ اقبال نے کہا کہ میرا کوئی لیڈر نہیں، چند ہی برسوں بعد بار بار اعلان کرنے لگے کہ میرا لیڈر محمد علی جناح ہے، میں جناح کا سپاہی ہوں۔ ''ہندوستان کے مسلمانوں میں صرف جناح مسلمانوں کا سچا لیڈر اور نجات دہندہ ہے'' ۔ وجہ؟ جناح انگلستان سے واپس آ گئے تھے۔ خدارا ذرا سوچیے کہ ان لیڈروں کا مسلمانوں کی ہندو اور انگریز حکمرانی سے نجات میں کوئی ذاتی فائدہ تھا؟ قیام پاکستان کیا ان کا ذاتی مفاد تھا؟ آج پاکستان میں خوشحال، آزاد اور باعزت زندگی گزارنے والے علامہ اقبال اور قائداعظم کے مقروض ہیں، لیکن افسوس کہ عوام محرومیوں کے باوجود ان لیڈروں کو عقیدت کے اعلیٰ ترین مقام پر بٹھاتے ہیں، جب کہ دولت، عہدوں اور دنیاوی عزت میں کھیلنے والے ان پر تنقیص اور تنقید کے تیر برساتے ہیں۔ مطالعہ اس قدر سطحی کہ قابل رحم۔ نہ اپنی تاریخ کی روح کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اقبال و جناح کو پوری طرح پڑھنے کی توفیق ملی ہے۔ میں خود نیم خواندہ ہوں اور اپنے مطالعے کی کم مائیگی پر افسردہ رہتا ہوں، لیکن جب ان عالموں فاضلوں کی تحریریں پڑھتا ہوں، تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اقبال کو سرکاری سرپرستی کا الزام دینے والے نہیں جانتے کہ اس وقت کے موسٹ پاورفل مسلمان لیڈر فضل حسین نے علامہ اقبال کو ہائی کورٹ کا جج بنوانے کے لیے انگریز حکمرانوں سے سفارش کی اور پھر افسوس سے کہا کہ علامہ اقبال نے ''بے لگام تنقید لکھ کر حکومت کی ہمدردی کھو دی'' ۔ وقت ملے تو علامہ اقبال کی پنجاب اسمبلی میں تقاریر اور کارروائیاں ملاحظہ فرمائیں۔ وہ بات قدرے دور نکل گئی۔ ذرا سوچیے کہ پاکستان کی نظریاتی اساس اور جغرافیائی حیثیت کی علامتیں کون ہیں؟ ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ۔ یہی دو شخصیات قوم کی فکری وحدت، ہم آہنگی اور اتحاد کا ذریعہ اور چشمہ ہیں۔ ان پر شکوک اور

Co

Marfat.com

تنقیص کے پتھر مار کر گویا آپ قومی اتحاد کی علامتوں کو ڈھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے۔ کس قدر افسوس ناک ہے یہ صورت کہ سندھ کے بعض دانش ور راجہ داہر کو اپنا لیڈر کہتے ہیں، پنجاب کے چند دانش ور شاہی مسجد کو اصطبل بنانے والے رنجیت سنگھ کو اپنا لیڈر سمجھتے ہیں اور خیبر پختونخواہ کا ایک خاص گروہ باچا خان کو قائداعظم سے بڑا لیڈر ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس طرح صوبوں کو ذہنی اور فکری حوالے سے ایک دوسرے سے دُور کیا جا رہا ہے؟ یہ نہ صرف اپنی تاریخ کی نفی ہے، بل کہ صوبوں کے درمیان ذہنی فاصلے پیدا کر کے پاکستان کو کمزور کرنے کی بھی جسارت ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں، جن کے بارے میں قائداعظم نے قوم کو انتباہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنی صفوں میں چھپے ہوئے منافرت پھیلانے والوں سے ہوشیار رہو۔ کاش مزید جگہ ہوتی تو بہت کچھ لکھتا۔

Marfat.com

خود احتسابی کی دولت

زندگی کے ہر صفحے پر ایک نیا سبق رقم اور موجود ہے شرط ہے، غور کرنے اور سیکھنے کی، اگر غور نہ کیا جائے اور تجربات، مشاہدات اور مطالعے سے کچھ نہ سیکھا جائے، تو زندگی کی تیز ہوا انسان کو چھو کر گزر جاتی ہے اور انسان ان تجربات سے کشید ہونے والے سبق کی روشنی سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے زندگی کی کتاب سب سے اہم، ضخیم اور سبق آموز ہوتی ہے، شرط یہ ہے کہ انسان غور کرنے کی عادت ڈالے۔ سچی بات یہ ہے کہ غور کرنا ایک ایسی عادت ہے، جس کی مسلسل پرورش کرنی پڑتی ہے، ورنہ غور کا دروازہ کسی وقت بھی بند ہو سکتا ہے۔ میں اپنے اردگرد بے شمار لوگوں کو دیکھتا ہوں، جنھوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے۔ جدھر ہوا کا رُخ ہو، وہ اُدھر چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے حالات میں تبدیلی لانے کی صلاحیت سے اس لیے محروم ہو چکے ہیں کہ انھوں نے غور و فکر کا دروازہ بند کر لیا ہے اور اپنے آپ کو حالات کے دھارے کے سپرد کر دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ حالت، یہ کیفیت اور یہ رویہ انسان کے مرتبے، خالق کی منشا اور انسانی صلاحیتوں کی نفی ہے، کیوں کہ خالق حقیقی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسے ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اس لیے، اگر وہ اپنے آپ کو حالات کے ہاتھوں کے سپرد کر دے، تو پھر اس میں اور اس حیوان میں کیا فرق رہا، جو شعور، صلاحیت اور غور و فکر سے محروم ہونے کی وجہ سے اس طرف چل پڑتا ہے، جدھر اس کا چرواہا اسے ہانکتا ہے۔

بات ذرا دُور نکل گئی۔ کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ میرے تجربات و مشاہدات نے مجھے سکھایا ہے کہ انسانی رویے بہ ذات خود تجربات و مشاہدات اور مطالعے کے سانچے میں ڈھلتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انسانی رویے بنانے اور انھیں مخصوص انداز سے تشکیل دینے میں تجربات، مشاہدات اور مطالعے کا بہت بڑا

Marfat.com

حصہ ہوتا ہے، شرط یہ ہے کہ انسان اپنا ''غوردان'' کھلا رکھے اور غور وفکر کی کھڑکیوں میں تازہ ہوا کو داخل ہونے دے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر انسانی رویے، انسانی ردعمل اور عادات بدلتی بھی رہتی ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف اور الگ الگ بھی ہوتی ہیں، کیوں کہ انسانوں کے تجربات اور ماحول اور تربیت اپنی اپنی اور الگ الگ ہوتی ہے۔ کل بارش کے بعد زمین گیلی ہو چکی تھی اور ہر طرف پھسلنے کا خاصا سامان موجود تھا۔ جن موٹر سائیکل سواروں نے اس سے قبل پھسلن کا مزا چکھ کر اور کئی روز تک بستر پر لیٹ کر زخموں کا مزا لیا تھا، وہ بڑی احتیاط سے سائیکل موٹر چلا رہے تھے۔ اچانک سڑک پر ایک سولہ سترہ سال کا جوان لڑکا سینہ تانے سائیکل موٹر بھگاتا نظر آیا۔ اسے گرنا ہی تھا، موڑ مڑتے ہوئے گرا، لیکن اللہ کے فضل وکرم سے شدید زخموں سے محفوظ رہا۔ جب وہ گرنے کے بعد اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا، تو ایک ادھیڑ عمر کا شخص اس کی جانب بڑھا اور اسے ہاتھوں اور پاؤں سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ زور زور سے کہہ رہا تھا ''حرام زادے۔ سائیکل موٹر چلانا نہیں آتا۔ باپ سے چوری چوری سائیکل موٹر لے آتے ہیں اور حادثات کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کو مارتے ہیں، کبھی خود کو مارتے ہیں۔ یہ پولیس بھی حرام زادی کرپٹ ہے۔ ان سے نہیں پوچھتی کہ ڈرائیونگ لائسنس بھی ہے یا نہیں''۔ وہ جب پانچ دس طمانچے مار چکا تو اتنے میں ایک سفید ریش بزرگ اُدھر سے گزرا۔ اس نے نوجوان کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا، پوچھا کوئی گہری چوٹ تو نہیں آئی، پھر اسے سمجھانے لگا کہ دیکھ بیٹا گیلی سڑک پر سائیکل موٹر پھسل جاتا ہے، اس سے سر بھی پھٹ سکتا ہے، ٹانگ بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ بڑے احتیاط سے سائیکل موٹر چلایا کرو...... ایک ہی واقعے یا ایک ہی حادثے پر دو مختلف ،بل کہ متضاد رویے اور سلوک کیوں؟ اس لیے کہ ہر انسان کا رویہ، اخلاق اور انداز اپنا اپنا ہوتا ہے، وہ پیداوار ہوتا ہے اپنے اپنے پس منظر، اپنے اپنے تجربات و مشاہدات، تربت اور مطالعے کی...... کچھ لوگ قطار (کیو) میں کھڑے صبر سے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں، کچھ سینہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کچھ قطار کی پرواہ کیے بغیر اکڑتے ہوئے آگے چلے جاتے ہیں۔ ان کو اس سینہ زوری سے منع کرو تو کچھ لوگ منع کرنے والے کو گھور کر آگے بڑھ جاتے ہیں، کچھ اس کا گریبان پکڑ کر اسے منع کرنے کی سزا دینے پر تل جاتے ہیں اور کچھ ''سوری'' کہہ کر قطار میں لگ جاتے ہیں۔ کچھ حضرات کی اَنا کوہ ہمالیہ کی بلندی پر تشریف فرما ہوتی ہے۔ وہ کسی انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ انھیں دنیا کی ہر شے کم تر اور ہیچ لگتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو کائنات کا محور اور دوسروں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں۔ کچھ حضرات خاص طور پر مقتدر حضرات کی گردنیں اتنی اکڑی ہوتی ہیں کہ دیکھنے والے محسوس کرتے ہیں، جیسے ان میں سریا فٹ کر دیا گیا ہے۔ انھیں نہ موت کا خوف اور

Marfat.com

نہ ہی زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوتا ہے۔ان کے برعکس آپ کو ایسے لوگ بھی ملتے ہیں، جو انسان کو انسان سمجھتے ہیں، ان میں انسانیت کے احترام کا جذبہ بھی نظر آتا ہے اور وہ دوسروں کو برابری کی سطح پر بٹھاتے ہیں، جب کہ کم اور بہت کم ایسے انسان بھی ملتے ہیں، جو اپنے آپ کو سب سے کم تر اور حقیر سمجھتے ہیں۔ان حضرات پر صوفی ازم کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ہمہ وقت اپنے نفس کی ملامت کرتے رہتے ہیں تا کہ نفس پھل پھول کر اور ''تگڑا'' ہو کر انھیں کسی احساس برتری، گھمنڈ یا غرور میں مبتلا نہ کر دے۔نفس پر سواری کی راہ نہایت کٹھن، دشوار گزار اور صبر آزما ہوتی ہے، اس لیے اس راہ پر بہت کم لوگ قدم رکھتے اور چلتے ہیں، ورنہ وہ تمام لوگ، جو آپ کو احساس برتری، گھمنڈ، غرور اور دنیا کی ہوس کی منزلیں طے کرتے نظر آئیں گے، وہ سب نفس کے غلام ہوتے ہیں۔انھیں ہرگز علم نہیں ہوتا کہ ان پر نفس سواری کر رہا ہے، جب کہ وہ خود اقتدار اور دولت کے زور پر لوگوں پر سواری کر رہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ حسد، غصہ، انتقام، بغض، کینہ، احساس برتری، سینہ زوری وغیرہ وغیرہ انسانی جبلتیں ہیں، یعنی انسانی فطرت میں موجود ہوتی ہیں، جو حضرات غور و خوض کے عادی ہوں، زندگی کے تجربات و مشاہدات اور مطالعے سے فائدہ اُٹھا کر اور ان سے سبق سیکھ کر اپنی سوچ، رویے اور شخصیت کو بدل لیں، وہ کافی حد تک ان جبلتوں پر قابو پا لیتے ہیں اور جو اپنی عادات، مزاج اور رویوں پر غور نہیں کرتے، خود احتسابی کی صفت سے محروم ہوتے ہیں۔وہ اپنے آپ کو بدلنے یا بہتر بنانے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔میں خود بھی نیم خواندہ انسان ہوں، اس لیے کچھ نہیں جانتا، لیکن میرا خیال ہے کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق غور و فکر، خود احتسابی اور اپنے آپ کو بہتر بنانے کے جذبے اور صلاحیت کا ہے، جسے دوسرے الفاظ میں شعور کہا جاتا ہے، یعنی انسان کو شعور عطا کیا گیا ہے اور حیوان کو شعور عطا نہیں کیا گیا۔گویا جو لوگ خود احتسابی اور شعور سے فائدہ نہ اُٹھائیں اور خود کو انسانی جبلتوں کا اسیر اور قیدی بنا لیں وہ انسانی سطح پر زندگی گزارتے، بل کہ حیوانی سطح پر زندہ رہتے ہیں، چاہے وہ اپنے آپ کو کتنا ہی ارفع و اعلیٰ سمجھیں۔گویا خود احتسابی انسان کی دولت ہے نہ کہ محض روپیہ پیسہ......!!خود احتسابی سے قلب روشن ہوتا ہے اور انسان بہتری کی جانب گامزن رہتا ہے، جب کہ دولت سے نخوت اور غرور کے خزانے پھلتے پھولتے ہیں۔ہاں یاد رکھیے، اگر خود احتسابی عاجزی پیدا نہ کرے، تو پھر وہ خود پرستی ہے۔خود پرستی سے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا ایک فرمان یاد آ گیا، غور کیجیے کہ انھوں نے حکمت کے سمندر کو ایک فقرے میں سمو دیا ہے۔حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا فرمان ہے ''خود پرستی اور نفس پرستی ہی دراصل بت پرستی ہے اور اس کو ترک کرنے کے بعد کہیں خدا پرستی کی منزل شروع ہوتی ہے''۔

Marfat.com

موجودہ سیاسی کلچر کی جہتیں

موجودہ سیاسی منظر اور سیاسی کلچر کی کئی جہتیں ہیں اور ان سب پر تھوڑی تھوڑی روشنی ڈالنا ضروری ہے، ورنہ تحریر غیر متوازن اور اکثر اوقات یک طرفہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے دانش وروں اور کالم نگار حضرات کی اکثریت اپنے اپنے مورچے سنبھالے بیٹھی ہے، انھیں کسی کے خلاف نفرت کا آتش فشاں بھڑکانا ہوتا ہے یا کسی کے دفاع اور تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے ہیں، کسی کا حق نمک ادا کرنا ہے یا اِدھر اُدھر سے اکٹھی کی گئی معلومات سے تحریر کو سجا کر سنسنی خیز بنانا ہے، وغیرہ وغیرہ، چناں چہ اس ساری مشق ستم میں توازن محبتوں اور نفرتوں کی وادی میں گم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف بے تحاشا تجزیات کے سمندر بہہ رہے ہیں، کیوں کہ سیاسی تجزیے، آسان ترین کام اور تیزی سے فروخت ہونے والا مال ہے۔ بس روزانہ دو تین اخبارات پڑھ لو اور اندازوں کے غبارے چھوڑنے شروع کر دو۔ وہ اندازے کس قدر درست نکلے؟ وقت کے تیز بہتے دھارے میں اس کا حساب لگانے کی کسے فرصت ہے؟ یہی وجہ ہے کہ مجھے خیر خواہ دوست اور ہمدرد قارئین سیاسی تجزیوں پر قلم اُٹھانے سے منع کرتے ہیں اور اس بات کی تلقین کرتے رہتے ہیں کہ اہم سنجیدہ قومی، علمی، مذہبی، معاشرتی اور تاریخی موضوعات پر لکھتے رہو اس سے قارئین کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ذہنی تربیت کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ میری زندگی کا معتدبہ حصہ پاکستان کی تاریخ و سیاست پر تحقیق کرتے اور کتابیں لکھتے گزرا ہے، اس کے باوجود میں سیاسی تجزیوں سے "پرہیز" کرتا ہوں، لیکن کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے اور قارئین کو تبدیلی کا احساس دلانے کے لیے سیاست کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے باز نہیں آتا اور ہاں مجھے کہنے دیجیے کہ ہمارے ہاں جمہوریت کے حسن کا بڑا چرچا ہوتا ہے اور اس چرچے کے چکر میں ہر قسم کی بدصورتی بھی جمہوریت کے حسن میں شامل کر دی جاتی ہے، جو بہ قول شخصے

Marfat.com

"یہ بھی جمہوریت کا حسن ہے" لیکن میں آپ کی توجہ جمہوریت کے اصل حسن کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ ہے توازن، برداشت اور احتساب اور آزادیٔ فکر و اظہار..... ذرا غور کیجیے، تو احساس ہوگا کہ یہ سارے دین اسلام کے اہم اور بنیادی اصول ہیں۔ مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ توازن، برداشت، حسن اخلاق سیرت نبویؐ کے بنیادی سبق ہیں اور اس کے علاوہ سیرت نبویؐ کے اور بھی ان گنت پہلو ہیں، جن سے مسلمان اچھی طرح آگاہ ہیں، لیکن ہم ان پر عمل نہیں کرتے جس کے مظاہرے قدم قدم پر ملتے ہیں، بل کہ سچ تو یہ ہے کہ عدم توازن، عدم برداشت اور عدم حسن اخلاق ہمارا قومی کردار بن چکے ہیں، جب کہ غیر مسلمانوں میں یہ جنس بہ افراط ملتی ہے۔ چلیے اس موضوع کو طول نہیں دیتے، ورنہ آپ سمجھیں گے میں وعظ کر رہا ہوں، حالاں کہ میں صرف اپنے تجربات و مشاہدات کا ذکر کر رہا ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جس قسم کا سیاسی کلچر پاکستان میں پروان چڑھ رہا ہے، اس کی کئی جہتیں ہیں، جن پر غور کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس کالم کا مقصد ان کی نشان دہی کرنا ہے نہ کہ علاج تجویز کرنا، کیوں کہ ہر سیاسی پارٹی کے پاس اپنے اپنے ڈاکٹر موجود ہیں۔ موجودہ سیاسی رجحانات کو سمجھنے کے لیے بھی اپنی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے تا کہ سمجھا جا سکے کہ ہم کہاں اور کس طرف جا رہے ہیں۔ ایک تاریخی واقعہ یاد آ گیا ہے۔ پہلے وہ بیان کرنے دیجیے۔ آپ کو علم ہوگا کہ گاندھی جی پرارتھنا کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے، جس میں خاصے لوگ شریک ہوتے تھے۔ ایک بار گاندھی جی اپنے چاہنے والوں کے ساتھ لنگوٹی پہنے پرارتھنا میں مصروف تھے کہ اچانک کہیں سے سانپ نکل آیا، پھر سانپ کسی اور بل میں گھس گیا۔ ہندو پریس نے اس واقعے کو گاندھی جی کی کرامت کے طور پر اچھالا۔ قائداعظمؒ سے تبصرے کے لیے کہا گیا، تو انھوں نے مسکراتے ہوئے چند الفاظ کہے، جن میں شائستہ طنز بھی تھی اور ہندو ذہنیت پر ہلکی سی چوٹ بھی۔ قائداعظم نے کہا کہ "یہ باہمی آداب کا مظاہرہ تھا"۔ تحریک پاکستان کے صفحات کھنگالتے ہوئے مجھے کوئی ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملا، جس میں قائداعظم گاندھی، نہرو، پٹیل اور ان کے رفقا نے ایک دوسرے کے لیے تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ استعمال کیے ہوں۔ سارے مخالف ترین سیاسی لیڈران اور متحارب دھڑے ایک دوسرے کا ذکر مہذب انداز میں کرتے تھے۔ 1940ء کی دہائی میں سیاسی ٹمپریچر کا اندازہ آج نہیں لگایا جا سکتا، لیکن جب سیاسی گرمی اور حدت عروج پر تھی، اس وقت بھی قائداعظم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں جو سخت سے سخت فقرہ کہا وہ سیاسی حقائق کا نچوڑ اور تہذیب کی حدود کا مظہر تھا۔ انھوں نے کہا مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے شو بوائے ہیں، یعنی کانگریس نے انھیں صرف مسلمانوں کی نمایندگی کا تاثر دینے کے لیے "نمایشی" بنا رکھا ہے،

Marfat.com

ورنہ کانگریس کی فیصلہ سازی میں ان کا کوئی کردار نہیں، پھر یہ بات کابینہ مشن کے موقع پر ثابت ہوگئی جب کابینہ مشن پلان کو مسترد کرنے کے لیے نہرو نے مولانا کو ہٹا کر خود کانگریس کی سربراہی سنبھال لی۔

مقصد کہنے کا یہ تھا کہ نصف صدی کی سیاسی جدوجہد میں جو بالآخر تقسیم ہند پر منتج ہوئی، فتوے بھی جاری ہوئے، تنقید کے تیر بھی چلائے گئے، لیکن گالم گلوچ تک نوبت کبھی نہیں آئی۔ ذاتی جملوں سے بھی گریز کیا جاتا رہا، سوائے احرار کے مولانا اظہر کے، جنھوں نے قائداعظم کو کافر اعظم کہا۔ اس حملے کو نہ صرف مسلم لیگ نے اگنور کیا، بل کہ مجلس احرار کے سنجیدہ حلقوں نے بھی اس پر افسوس کا اظہار کیا۔ قائداعظم کے ساتھی 1958ء تک سیاست کے میدان میں معرکے لڑتے رہے۔ انتخابات بھی ہوئے اور 1958ء میں انتخابی مہم بھی زوروں پر تھی، جسے جنرل ایوب خان اور سکندر مرزا نے سبوتاژ کر دیا، لیکن ساری سیاسی مہم تہذیب کے دائرے تک محدود تھی۔ ان کے بعد ایوب خان آئے تو وہ جلسوں میں اپوزیشن کو ''دلا'' لوگ کہا کرتے تھے، جو ہماری لغت میں انتہائی قابل اعتراض لفظ ہے۔ مادر ملت کے خلاف انتخابی مہم میں گھبرا کر ایوبی کیمپ کی جانب سے تہذیب سے گری ہوئی حرکات کی گئیں، جو ان کے خلاف گئیں۔ یہاں سے ایک ایسا سیاسی دور شروع ہوا ، جس میں تہذیب واخلاق کے بندھن ٹوٹنے لگے۔ اسے آپ آمرانہ ورثہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے اپنی سیاسی مہم میں عوامی لہجہ اپنانے اور جلسوں میں شریک ہجوم کا دل لبھانے کے لیے اصغر خان کے لیے آلو خان اور خان قیوم خان کے لیے ڈبل بیرل خان کے القابات استعمال کیے جو ذو معنی بھی تھے اور قدرے مزاحیہ بھی، لیکن اس کے جواب میں دائیں بازو کے دانشوروں نے ہاتھ اتنے لمبے کیے کہ ان کی مرحوم والدہ صاحبہ کے دامن تک جا پہنچے۔ کچھ ایسا ہی سلوک محترمہ بینظیر بھٹو اور محترمہ نصرت بھٹو سے بھی کیا گیا، لیکن داد دیجیے جناب زرداری صاحب کو، انھوں نے محترمہ نصرت بھٹو کی نیم عریاں تصاویر چھاپنے والوں کو بھی سینے سے لگا لیا، انھیں عہدے بھی دیے اور پیسے بنانے کا موقع بھی دیا۔ کچھ لوگ اسے زرداری صاحب کی بھٹو سے بے وفائی پر معنون کرتے ہیں اور کچھ اسے ان کی حکمت عملی کا شاہکار قرار دیتے ہیں۔

اب میں دیکھ رہا ہوں کہ توازن، برداشت اور حسن اخلاق کے بند ٹوٹ رہے ہیں۔ ہمارے لیڈران بدتمیزی کے سیاسی کلچر کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہ نہ ہی صرف ہمارے دینی اور مذہبی اصولوں کی نفی ہے، بل کہ اس رویے سے جمہوریت کی بنیادوں پر بھی زد پڑتی ہے۔ کیا ہم یہ کلچر اپنی آیندہ نسلوں کو میراث کے طور پر منتقل کرنا چاہتے ہیں؟ یہ لمحہ فکریہ ہے! ہم سب کے لیے، ہمارے سیاستدانوں، کارکنوں، دانشوروں اور قوم کے لیے......!!

Marfat.com

ہمارے سیاسی کلچر کی جہتیں (II)

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے موجودہ سیاسی کلچر کی بہت سی جہتیں ہیں، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ وقت کے ساتھ بدلی نہیں، جب کہ ارتقائی عمل نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ میں اپنے سیاسی کلچر پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہوں، تو مجھے موجودہ سیاست اور آج سے چھ دہائیاں قبل کے سیاسی کلچر میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ آپ اسمبلیوں پر نظر ڈال لیں۔ بہت بڑی اکثریت موروثیت کی پیداوار، فیوڈل کلچر کی نمایندہ، جمہوری اقدار کی باغی، برادری ازم کی قائل، لیڈر شپ کی پجاری اور مفاد پرستی کی اس قدر غلام کہ اسے سیاسی وفاداری بدلتے نہ دیر لگتی ہے اور نہ ہی ان کا ضمیر خان خلش کا شکار ہوتا ہے۔ عدلیہ طاقت ور ہوگئی، میڈیا آزاد ہوگیا، سیاسی عمل جاری ہے اور بہت سے انتخابات کے ذریعے جمہوری عمل مضبوط ہو چکا ہے، لیکن اگر کچھ ادارے خاطر خواہ ارتقا سے محروم ہیں، تو وہ ہیں اسمبلیاں، سیاسی جماعتیں اور ہمارے سیاست دان مطلب یہ کہ وہاں تبدیلی کے آثار کم کم نظر آتے ہیں، اگر میں تجزیہ کروں تو مجھے 1950ء کی دہائی کے سیاسی کلچر اور موجودہ سیاسی کلچر میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ ہاں چہرے ضرور بدلے ہیں کہ یہ قانون قدرت ہے اور قانون قدرت نے پرانے چہروں کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔ انھی چہروں سے نئے چہرے سامنے آگئے ہیں، کیوں کہ حکمرانی ان کا پیدائشی حق ہے اور غلامی پاکستان کے عوام کا مقدر ہے۔ مقدر کیوں ہے؟ قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

Marfat.com

جب تک ہم انھی جاگیرداروں، وڈیروں، موروثی سیاسی خاندانوں اور امرا کو دولت اور اثر ورسوخ کی بنا پر ووٹ دیتے رہیں گے، یہ سیاسی کلچر نہیں بدلے گا اور نہ ہی سیاسی کرپشن، اقربا پروری، سفارش کلچر، سیاسی بے وفائی اور خاندانی حکمرانی کے رجحانات پر قابو پایا جا سکے گا۔

میرے مطالعے اور مشاہدے کے مطابق پارٹی وفاداری اور نظریاتی کمٹمنٹ جمہوری ڈھانچے میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں سیاسی بے وفائی، پارٹیاں بدلنا اور سیاست کو مقامی ضروریات اور مفادات کے تابع رکھنے کا سلسلہ صدیوں پرانا ہے۔ یہ بادشاہت اور فیوڈل کلچر کی یادگار ہے، لیکن اس روایت کو مضبوط بنانے اور پروان چڑھانے میں انگریز کی حکومت اور صد سالہ غلامی نے سب سے اہم رول سرانجام دیا۔ 1940ء کی دہائی سے عوام میں سیاسی بیداری کا عمل تیز ہو کر توانا ہوا تو قائداعظمؒ کی سربراہی میں مسلمانانِ ہند مسلم لیگ کے جھنڈے تلے منظم ہونا شروع ہو گئے۔ انھوں نے انگریز حکومت اور بااثر جاگیرداروں کی تابع فرمانی کی زنجیریں توڑ کر قائداعظم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا، جو جمہوریت، قانون کی حکمرانی اور روشن خیالی کی علامت تھے۔ اس سے ایک امید نے جنم لیا کہ اب مسلمان عوام فیوڈل کلچر سے آزادی حاصل کر لیں گے۔ جاگیرداروں اور فیوڈل لارڈز نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور حکمرانی کے بام تک پہنچ گئے، کیوں کہ وہ اس فن کے ماہر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تبدیلی سبوتاژ ہو گئی، جس کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جاگیرداری کی زنجیروں کو ڈھیلا کرنے کے لیے زرعی اصلاحات کا ڈول ڈالا گیا، لیکن طاقت ور جاگیرداروں نے اس عمل کو منطقی انجام تک پہنچنے نہ دیا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان زندہ رہتے اور کسی نہ کسی طرح جمہوری عمل جاری وساری رہتا تو شاید زرعی اصلاحات بھی مرحلہ وار ہوتیں اور سیاسی عمل کے ذریعے عوام کی سیاسی بیداری اور تربیت کا سلسلہ بھی جاری رہتا، لیکن لیاقت علی خان کی شہادت نے امید کی یہ شمع بھی بجھا دی۔ فوجی حکمرانی اور حکومت ویسے ہی جاگیرداروں کی تابع فرمان اور ''جی حضوری'' کی مرہونِ منت ہوتی ہے، چناں چہ ایوبی آمریت کے دوران جاگیرداری اور موروثیت کی جڑیں مزید گہری اور مضبوط ہوئیں۔ اسٹیٹس کو، جمہور اور طرزِ کہن کو چیلنج کر کے بھٹو صاحب نے مقبولیت حاصل کی، حتیٰ کہ عوام نے انھیں نجات دہندہ سمجھ کر کندھوں پر اُٹھا لیا اور آنکھوں میں سجا لیا، لیکن وڈیرہ بالآخر وڈیرہ ہی ہوتا ہے۔ بھٹو صاحب عوام کو عوام کی حکمرانی کا خواب دکھا کر وڈیروں اور جاگیرداروں کے ساتھی بن گئے اور سب کچھ جاننے کے باوجود ان کی حمایت پر تکیہ کر کے طویل حکمرانی کے ارادے باندھنے لگے۔ بھٹو صاحب جیسے ذہین وفطین انسان کو کون سمجھاتا کہ حضور صرف

Marfat.com

عوام کی محبت وحمایت ہی طویل حکمرانی کی ضمانت دیتی ہے نہ کہ وڈیروں، طالع آزماؤں جاگیرداروں، مفادات کے اسیر ابن الوقت سیاست دانوں اور جی حضوریوں کی خوشامد...... دولت منداور جاگیردار یالینڈ لارڈ اپنے ہی جیسوں میں خوش ومطمئن رہتا ہے۔ وہی اس کے دوست اور وہی اس کے دست وبازو ہوتے ہیں۔ سب کا مشترکہ مفاد عوام پر حکمرانی ہوتا ہے۔ بھٹوصاحب کے دوست پنجاب وسندھ کے وڈیرے اور موروثی لینڈ لارڈ تھے۔ کس کس کا نام لوں کہ تعداد خاصی بڑی ہے۔ جلسے جلسوں کی اور بات ہے، وگرنہ امرا کو غریبوں سے پسینے کی بُو آتی ہے۔ میرے ایک سابق سفیر دوست نے بتایا کہ جب محترمہ بینظیر بھٹو پہلی بار وزیراعظم بنیں، تو ان جیالوں اوران کے والدین کو عمرے پر لے کر گئیں، جنھوں نے ضیاء الحق کے دور حکومت میں کوڑے کھائے تھے، جیل کی صعوبتیں برداشت کی تھیں، جلاوطنی بھگتی تھی اور ان میں سے کچھ صعوبتیں برداشت کرتے کرتے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس سچے سفیر کے بقول محترمہ ان غریب خواتین کے جھرمٹ میں مسجد نبوی میں تشریف فرما تھیں، تو مجھے بلاوا آیا۔ حاضر ہوا تو وزیراعظم نے حکم دیا مجھے جلد واپس ہوٹل پہنچاؤ، سعودی حکومت کے پروٹول کو الرٹ کروکہ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ عرض کیا سعودی پروٹوکول کو یہاں دو گھنٹے قیام کا بتایا تھا، ابھی تو بہ مشکل نصف گھنٹہ ہوا ہے۔ محترمہ نے کہا کہ جلدی کرو۔ مجھے ان خواتین کے پسینہ زدہ کپڑوں سے بدبو آرہی ہے، جو میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ مجھے ابکائی آرہی ہے۔ مختصر یہ کہ انھیں فوری طور پر واپس ہوٹل لانے کا انتظام کیا گیا اور وہ غریب خواتین ایثار وقربانی کی علامتیں، جن کے زور پر محترمہ وزیراعظم بنیں تھیں، بے بسی سے ان کی رخصتی کا سماں دیکھتی رہیں اور ان کے نقش پا یہ واری صدقے جاتی رہیں۔ دوستو! دولت مند حکمران، جاگیردار، وڈیرہ ملک میں اصلاحات بھی نافذ کرسکتا ہے، معاشی ترقی کے لیے اقدامات بھی کرسکتا ہے، کیوں کہ یہ کارنامے ووٹ لینے کے لیے ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن اسے ہمیشہ غریب عوام کے کپڑوں سے بدبو آتی رہے گی اور وہ کبھی اپنے مفادات کو جمہور کے مفادات پر قربان نہیں کرے گا، وہ ہمیشہ اپنے صنعتی، کاروباری، زرعی اور جاگیردارانہ مفادات کو ترجیح دے گا اور موروثیت کی نرگسیت کا اسیر رہے گا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ پاکستان میں صحیح جمہوری انقلاب اس وقت آئے گا، جب عوام میں سچا سیاسی شعور جنم لے گا اور وہ اپنے جیسوں کو اسمبلیوں میں بھیجیں گے، اپنے جیسوں کو اقتدار سونپیں گے۔ چند برس پہلے بھی امید کا ایک چراغ جلا تھا لیکن وہ بجھ گیا، اصولوں پر مفادات غالب آ گئے اور تبدیلی کی امید دم توڑ گئی۔ بھلا کیسے؟

Marfat.com

ہمارے سیاسی کلچر کی جہتیں (III)

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پاکستان کے سیاسی کلچر کی کئی جہتیں ہیں، جن پر نگاہ رکھ کر ہی سیاسی ادراک کی کھڑکیاں کھلتی ہیں اور سیاست دانوں کے رویے سمجھ میں آتے ہیں۔ ہمارے سیاسی کلچر کی سب سے اہم جہت فوجی مداخلت ہے۔ اس حوالے سے بڑے سیاست دان ایک دوسرے کو فوجی پیداوار کے طعنے بھی دیتے ہیں، لیکن اقتدار یا اپوزیشن دونوں میں رہتے ہوئے جرنیلوں کو محبت، عقیدت اور تابع فرمانی کی یقین دہانیاں بھی کراتے رہتے ہیں، چوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ کامیابی کے لیے ''دست غائب'' کی سرپرستی ناگزیر ہے۔ کامیابی سے مراد ''حاجات روائی'' ہے، جو حکمرانوں کی اور ہوتی ہیں اور اپوزیشن کی اور۔ اس صورت حال یا سوچ کا مظاہرہ عمران خان اور ڈاکٹر طاہرالقادری کے دھرنوں دونوں کے دوران بھی دیکھنے میں آیا۔ وزیراعظم صاحب نے آرمی چیف سے سہولت کار کا کردار سرانجام دینے کی درخواست کی، جب کہ عمران خان اور ڈاکٹر طاہرالقادری نے آرمی چیف سے ملاقاتوں میں اپنے اپنے مطالبات پیش کیے اور فوج سے ضمانت مانگی۔ گویا ہماری سویلین قیادت اپنے مسائل حل کرنے، فاصلے گھٹانے اور بحران پر قابو پانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور جب ذرا سیاسی آندھی چلتی ہے، تو سب کی نظریں جی ایچ کیو کی جانب اُٹھتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی بھی جمہوری ملک میں ایسا ہوتا ہے؟ اپنے ہمسائے ہندوستان پر نظر ڈال لیں۔ ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ہماری سیاست کبھی بھی فوجی چھاؤں اور جرنیلی سایوں سے نہیں نکل سکے گی نہ آزاد ہو گی، اس کی بنیادی وجہ ہماری سیاسی قیادت میں اہلیت کی کمی اور سیاسی حمایت کا بحران ہے۔ اسی حوالے سے اس دلچسپ پیش رفت پہ نگاہ ڈالیے اور لطف اُٹھائیے۔ چند روز قبل ڈاکٹر طاہرالقادری نے انکشاف کیا کہ آرمی چیف نے ملاقات میں ان سے میاں

Marfat.com

شہباز شریف کے استعفے کا وعدہ کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ وعدہ ماڈل ٹاؤن سانحے کی انکوائری کے تناظر میں کیا گیا تھا۔ اب تک کی روایت یہ ہے کہ کوئی غلط بات فوج سے منسوب کی جائے، تو آئی ایس پی آر فوراً حرکت میں آتا ہے اور اس محکمے کے سربراہ جنرل صاحب فوراً وضاحت جاری کرتے ہیں۔ وزیراعظم صاحب نے جب دھرنا بحران کے آغاز میں آرمی چیف سے مداخلت کی درخواست کے حوالے سے تردید کی تو آئی ایس پی آر نے وزارت عظمیٰ کا ''لحاظ'' کیے بغیر وضاحت جاری کی کہ وزیراعظم نے آرمی چیف سے خود کہا تھا کہ وہ دھرنے والوں سے بات چیت کریں، لیکن اس بار آئی ایس پی آر نے ڈاکٹر طاہر القادری کے اس بیان کی نہ تردید کی ہے اور نہ ہی وضاحت جس کا ''بین السطور'' مفہوم۔ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے کوئی ایسی کمٹمنٹ کی گئی تھی، اس لیے عسکری ذرائع خاموشی میں ہی مصلحت سمجھتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ وزیراعلیٰ کا استعفیٰ کتنی بڑی بات ہے اور اس کا وعدہ کون کرسکتا ہے یا عندیہ کون دے سکتا ہے؟ عندیہ دینے والا کتنا طاقت ور اور معاملات پر کس قدر حاوی ہوگا؟ کیا ہمارے سیاستدان کبھی اس ''حاوی'' فیکٹر سے نکل سکیں گے؟ میرا اندازہ ہے کہ کم سے کم موجودہ سیاسی قیادت تو نہیں نکل سکے گی مستقبل کا حال اللہ سبحانہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

اسی تناظر میں سیاسی خاندان ایک دوسرے کو فوج کی پیداوار کے طعنے دیتے ہیں، یہ الگ بات کہ دن کے اُجالے میں طعنے دینے والے رات کی تاریکی میں ان سے ملاقاتیں بھی کرتے ہیں۔ اسی تناظر میں عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری کے دھرنوں کے پس پشت کوئی غیر مرئی ہاتھ تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملکی سیاست میں جب بھی کوئی اہم پیش رفت ہوتی ہے یا ہلچل پیدا ہوتی ہے تو اندازوں کی نگاہیں ''اُن کی طرف'' اُٹھنا شروع ہوجاتی ہیں۔ بلاشبہ موجودہ عسکری قیادت نے فوج کو سیاست سے الگ تھلگ رکھنے کا تہیہ کیا ہوا ہے، لیکن آپ نے غور کیا کہ امریکا میں ہمارے آرمی چیف کی وزیراعظم سے بھی زیادہ پذیرائی ہوئی اور ان سے دہشت گردی کے خلاف بھرپور ایکشن جاری رکھنے کی ضمانت لی جارہی ہے؟ کیا امریکا کو ہماری سیاسی قیادت کی نسبت فوجی قیادت پر زیادہ اعتماد اور بھروسا ہے؟ کیا امریکا کو احساس ہے کہ پاکستان کی سیاسی قیادت امریکی دباؤ کے باوجود دہشت گردوں کے خلاف آرمی ایکشن پر راضی نہ ہوئی، جب کہ موجودہ عسکری قیادت نے بھرپور اور مؤثر کارروائی کی ہے اور یہی وہ خواہش ہے، جس کا امریکا گزشتہ کئی برسوں سے اظہار کررہا تھا۔ کیا آپ نے دیکھا اور سمجھا کہ افغانستان کے نومنتخب صدر نے بھی اپنے مسائل کا حل آرمی چیف سے ملاقاتوں ہی میں تلاش کیا اور

Marfat.com

سیاسی قیادت سے محض رسمی ملاقاتیں کیں۔ اس سے قبل ہمارے آرمی چیف کی افغانستان یاترا اور وہاں کی نومنتخب قیادت سے ملاقاتیں نہ صرف باہم اعتماد سازی کا ذریعہ تھیں، بل کہ ان میں اس حقیقت کا بھی سراغ موجود تھا کہ افغان قیادت ہماری سیاسی قیادت پر اتنا اعتماد کرتی جتنا فوجی قیادت پر کرتی ہے اور وہ براہ راست کچھ یقین دہانیاں جی ایچ کیو (Hourses Mouth) سے چاہتی ہے۔ میرے نزدیک آرمی چیف کی پہلے افغانستان یاترا اور پھر افغان صدر کا راولپنڈی میں جی ایچ کیو کا دورہ اور ان کے بعد ہمارے آرمی چیف کی امریکی دعوت نامے پر واشنگٹن وزٹ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ملاقاتیں دہشت گردی کے خلاف آپریشن کے شاخسانے ہیں اور باہمی اعتماد سازی کے عمل کا حصہ ہیں۔ بلاشبہ ایسا ہی ہے اور میں نہ صرف افغانستان سے دوستانہ اور مضبوط تعلقات کا شدید حامی ہوں، بل کہ امریکا سے بھی غلط فہمیاں رفع کی حمایت کرتا ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ اس وقت تینوں ممالک دہشت گردی کے خلاف آپریشن کے رشتے میں منسلک ہیں اور تینوں کی متفقہ حکمت عملی ہی سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کسی جمہوری ملک میں ایسے بنیادی اور اہم ترین ایشوز پر یقین دہانیاں اور حکمت عملی کے تانے بانے سیاسی قیادت سے جوڑے جاتے ہیں یا عسکری قیادت سے؟ ایک عام پاکستانی شہری کی حیثیت سے میں کہوں گا کہ ہمیں امن چاہیے، دہشت گردی کا خاتمہ ہماری اولین ترجیح ہے۔ فوج بھی ہماری اور آرمی چیف بھی ہمارا ہے۔ ہمیں اپنی فوج سے پیار ہے، لیکن ذرا رکیے اس سوال کا تو اس سے کوئی تعلق نہیں؟

سوال تو فقط یہ ہے کہ ایسے فیصلے کرنا کس کا کام ہے اور ان پر عملدرآمد کے لیے کسے اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے؟ ہاں یہ بھی سوچیے، اگر افغانستان اور امریکا کو یقین ہوتا کہ اس حوالے سے پاکستانی وزیر اعظم جو یقین دہانی کروادیں گے، اس پر فوج پوری طرح عمل کرے گی، تو کیا وہ سیاسی قیادت سے بات چیت پر اکتفا کرتے یا عسکری قیادت کو ترجیح دیتے؟ کیا دنیا کے دوسرے جمہوری ممالک میں ایسا ہی ہوتا ہے؟ دراصل اس مسئلے کی جڑیں ہماری تاریخ میں پیوست ہیں اور جنرل مشرف کے این آر او (جس میں جنرل کیانی کا رول اہم تھا) سے لے کر موجودہ سیاست تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تاریخی حوالے سے سمجھنے کے لیے ہماری تاریخ کے ایک اہم موڑ کو یاد کیجیے، جسے میں نے حوالوں کے ساتھ اپنی کتاب ''مسلم لیگ کا دور حکومت'' میں بیان کیا ہے کہ کس طرح پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے سیاسی قیادت سے بالا بالا واشنگٹن میں اپنے ملٹری اتاشی کے ذریعے امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے خط و کتابت کر کے

Marfat.com

تعلقات استوار کیے اور فوجی امداد کے عوض سنٹو سیٹو جائن کرنے کا عندیہ دیا اور کس طرح جنرل ایوب خان اور گورنر جنرل غلام محمد کی 1953ء میں امریکا یاترا کے دوران خواجہ ناظم الدین کو ہٹانے اور محمد علی بوگرہ کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ ہوا؟ محمد علی بوگرہ اس وقت واشنگٹن میں پاکستانی سفیر تھے اور امریکا کے قریب سمجھے جاتے تھے، یعنی امریکا کے ''گڈ بوائے'' تھے۔ شواہد موجود ہیں کہ 1954ء میں دستور ساز اسمبلی کو بھی امریکا کی آشیرآباد اور کمانڈر انچیف کی حمایت سے منسوخ کیا گیا تھا۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں، اس لیے اس پہلو یا اپنے سیاسی کلچر کی اس جہت کو تاریخی پس منظر میں دیکھتا ہوں۔ بہ ہر حال سوال یہ ہے کہ کیا ہماری تمام سیاسی قیادت اس قدر پختہ اور قد و قامت والی ہے کہ وہ جمہوریت کو عسکری سایے سے نکال سکے؟

Marfat.com

پاکستان کے سیاسی کلچر کی جہتیں (IV)

ہاں تو میں عرض کرر ہا تھا کہ پاکستانی جمہوریت کو خاکی سایوں سے نکالنا آسان کام نہیں۔ اس راہ میں قید و بند کے ساتھ پھانسی گھاٹ بھی آتا ہے اور جلاوطنی بھی...... ناز و نعمت کے پلے اور سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے کے لیے ان منازل کو طے کرنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان زنجیروں کو اپنے امیر جسموں پر سجاتے رہے ہیں اور کوئے یار سے کوئے دار تک جاتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ منزل ہنوز دُور است...... تاریخ بتاتی ہے کہ عسکری سیاسی اکادمی نے دو لیڈر تیار کر کے قوم کو دیے، لیکن ان دونوں کا جو حشر کیا وہ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کا سامان چھوڑ گیا۔ پی پی پی کے جیالے مسلم لیگ (ن) کے متوالوں کو طعنے دیتے ہیں کہ میاں نواز شریف فوج کی پیداوار ہیں۔ جواباً مسلم لیگ (ن) کے متوالے جیالوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ پی پی پی کا بانی جناب ذوالفقار علی بھٹو بھی تو فوج کی پیداوار تھا۔ اس بحث میں اُلجھے بغیر کہ کون کس کی پیداوار تھا، کس نے اقتدار کی سیڑھی پر چڑھنے کے لیے کس کو استعمال کیا اور کون کون اپنے مقدر کی مار کھا گیا۔ ذرا غور کیجیے! عسکری اکادمی سے تربیت لے کر نکلنے والے دونوں بڑے لیڈروں کا کیا حشر اور کیا انجام ہوا؟ دونوں لیڈران اپنی اپنی جماعتوں کے بانی اور قومی سطح پر اہم سیاسی قوتوں کے سربراہ اور راہنما ہیں، لیکن دونوں سے کیا سلوک ہوا؟ یہ ایک سبق آموز داستان ہے، جسے پھر کبھی پہ اُٹھا رکھتا ہوں، البتہ یہ یاد رکھیے کہ دونوں اگرچہ براستہ فوج آئے، لیکن لیڈر اپنی محنت اور قابلیت سے بنے۔ کس کس کا نام لوں کئی اسی راستے سے آئے، لیکن کیا وہ قومی سطح کے لیڈر بن سکے؟

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ فوج کی پہلی پیداوار جناب ذوالفقار علی بھٹو کو قید و بند میں ذلیل و خوار کرنے کے بعد پھانسی چڑھا دیا گیا۔ پہلے اقتدار کے تخت پہ بٹھایا، پھر پھانسی چڑھایا۔ تاریخ اسے عدالتی

Marfat.com

قتل قرار دے چکی ہے اور سپریم کورٹ کے سزا دینے والے جج جناب جسٹس نسیم حسن شاہ تسلیم کر چکے ہیں کہ بھٹو کو پھانسی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صدر جنرل ضیاالحق کے دباؤ کے تحت کی گئی، ورنہ وہ اس سزا کے مستحق ہرگز نہیں تھے۔ جنرل ضیاالحق کے معتمد اور نہایت قریبی ساتھی جنرل کے ایم عارف بھی اس راز سے پردہ اُٹھا چکے ہیں اور سب سے آخر میں تاریخ بھی اپنا فیصلہ سنا چکی ہے، لیکن اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ کچھ بھی نہیں۔ سانپ گزر گیا، اب لکیر پیٹتے رہو۔

فوج کی سیاسی اکادمی سے نکلنے والا دوسرا بڑا لیڈر میاں نواز شریف تھا، جسے اس وقت گرفتار کر کے اٹک جیل یا قلعے میں بند کر دیا گیا، جب وہ اپنے اقتدار کے نصف النہار اور عروج پر تھا۔ ناز و نعمت میں پلے میاں نواز شریف کو اٹک میں جس طرح ٹارچر کیا گیا اور ان کی تاریک کوٹھڑی کے سامنے درخت پر جس طرح سانپ لٹکا کر خوفزدہ کرنے کی کوششیں کی گئیں، اس نے میاں صاحب کی نفسیات پر گہرے نقوش اور اثرات مرتب کیے۔ تیسری بار وزیراعظم بننے کے بعد بھی شروع شروع میں جب ٹی وی کیمرہ ان پر فوکس ہوتا تھا تو چہرے پر لکھی گئی اذیت ماضی کی کہانی بیان کرتی تھی۔ میاں صاحب خوش قسمت ہیں، مقدر کے سکندر ہیں، وہ موت کے منہ سے بچ نکلے، ورنہ فاصلہ چند قدم کا ہی باقی رہ گیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے سودے بازی کی، کمپرومائز کیا، لیکن کیا ظلم کے پنجے سے جان چھڑانا بہتر حکمت عملی نہیں ہے۔ پرویز مشرف عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مکافات عمل ہے، لیکن یہ کیسا مکافات عمل ہے کہ وہ سب کچھ کر کے بھی چند منٹوں کے لیے جیل نہیں گیا، اپنے محلات میں عیش کرتا ہے اور کر رہا ہے، کیوں کہ اس کے پس پشت طاقت ور ہاتھ ہے۔ دھرنوں کا رشتہ بھی جنرل مشرف کے خلاف کارروائی سے جوڑا گیا اور اب اس کی رہائی کی پیشین گوئیاں بھی شدومد سے کی جا رہی ہیں۔ امکان یہی ہے کہ یہ پیشین گوئیاں درست ثابت ہونگی۔ دوسری طرف ہمارے سیاستدانوں کا رویہ بھی قابل غور ہے۔ لندن میں میثاق جمہورت پر دستخط کرنے اور عہد کرنے کے بعد کہ اب کبھی فوج کی لاٹھی کو اپنے مفادات کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ محترمہ بینظیر بھٹو جنرل مشرف سے این آر او کو حتمی شکل دینے کے لیے مصروف ہو گئیں اور جب این آر او کے بعد میاں صاحبان وطن واپس آئے، تو مسلم لیگ (ن) کے راہنماؤں نے بھی چوری چھپے جرنیلوں سے ملاقاتوں کے سلسلے شروع کر دیے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا...... اس ٹریک ریکارڈ کے ساتھ جمہوریت عسکری سایے سے کیسے نکل سکتی ہے؟

بات دُور نکل گئی۔ گزشتہ کالم میں، میں نے امید کے ایک چراغ جلنے اور بجھنے کا ذکر کیا تھا۔

Marfat.com

میری رائے میں اس سفر کے دوران ایک اہم موڑ آیا، جس نے اس امید کو جنم دیا کہ شاید اب پاکستان میں وفا فروشی، کرسی پرستی اور غیر سیاسی قوتوں کی کاسہ لیسی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں اور ہمارا وہ سیاسی طبقہ جو ہمیشہ فوجی اقتدار کی بیساکھی بنتا ہے اور چور دروازے سے ہمارے سروں پر مسلط ہو جاتا ہے، اس بار عبرت کا سامان بن جائے، لیکن یہ امید مصلحتوں اور ضرورتوں کی صلیب پر قربان کر دی گئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ وطن واپسی کے بعد میاں نواز شریف نے عوام سے اصولی سیاست کا وعدہ کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ وہ جنرل مشرف کے سابق ساتھیوں اور اس کی حکومت و اقتدار کا حصہ بننے والوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیں گے، نہ انھیں پارٹی میں جگہ دی جائے گی اور نہ ہی اقتدار کی قربت نصیب ہوگی۔ مقصد یہ تھا کہ غیر سیاسی قوتوں کی حوصلہ شکنی کی جائے، آمروں کا ساتھ دینے والوں کا سیاسی بائیکاٹ کر کے انھیں عبرت کے نمونے بنایا جائے۔ میڈیا نے اس فیصلے پر نہ صرف تحسین کے پھول برسائے، بل کہ اسے تاریخ کا سنگ میل قرار دیا۔ اس اصول کی حمایت میں، میں نے بھی خوب لکھا، لیکن پھر کیا ہوا؟ ابھی ہمارے کالموں کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ مشرف کے قریبی اور فنکار ساتھیوں نے میاں صاحب کی قربت میں سرنگ لگا کر راستے بنا لیے، حتیٰ کہ مشرف کی رخصتی پر آنسو بہانے والے میاں صاحب کے مشیر بن گئے یا بن گئیں۔ آج ان حضرات کی ایک تعداد نے میاں صاحب کو گھیر رکھا ہے اور ابھی کل ہی جناب زاہد حامد صاحب عدالتی کارروائی کے نتیجے پر وزارت سے مستعفی ہوئے ہیں، کیوں کہ عدالت نے غداری کیس میں ان کو بھی شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہی چہرے جو دن رات مشرف کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے، آج کل میاں صاحب کا دفاع کرنے پر مامور ہیں۔ ابن الوقتی ہماری جمہوریت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ میاں صاحب کے اس یوٹرن سے مصلحت اصول پر غالب آ گئی اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار جس اصولی سیاست کا خواب دکھایا گیا تھا، وہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا، امید کی جو شمع جلائی گئی، وہ بجھا دی گئی۔ بہت سے دیرینہ وفادار جن میں جناب غوث علی شاہ جیسے مخلص اور مشرقی صعوبتیں بھگتنے والے بھی شامل ہیں، مسلم لیگ (ن) سے دُور ہو گئے اور پھر وہی ابن الوقتی اور بے اصولی کا کلچر غالب آ گیا، جس نے ہر دور میں لیڈروں کو دھوکا دیا ہے۔ میاں صاحب اصول کی سیاست کو فروغ دے کر پاکستان کے سیاسی کلچر کو خاصی حد تک بدل سکتے تھے، لیکن نہ جانے کس خوف کے تحت وہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکے اور یوں انھوں نے ایک سنہری موقع کھو دیا۔ وہ، اگر مشرف کی یادگاروں کو کندھوں پر بٹھانے کے بجائے اپنے دیرینہ وفادار کارکنوں کی عزت افزائی کرتے، تو آج مسلم لیگ نسبتاً زیادہ مضبوط اور طاقت ور

Marfat.com

جماعت ہوتی ۔ بے اصولی کی سرپرستی کر کے مشکل وقت آنے پر اصول کی پیروی کی توقع نہیں کی جاسکتی ۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ میں کتابی باتیں کر رہا ہوں، جب کہ عملی سیاست کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں، لیکن یارو یاد رکھو! کتابی اصول روشنی کے مینار ہوتے ہیں، جب کہ عملیت پسندی کے تقاضے منافقت کا کھیل......!! کتابیں بتاتی ہیں کہ لیڈر بڑا نہیں ہوتا، اس کا کردار اور اس کے اصول اسے بڑا بناتے ہیں ۔ یاد رکھو کہ محمد علی جناح کو ان کے مقصد اور کردار نے قائد اعظم بنایا ہاں قائد اعظم......!! عظیم اور سب سے عظیم لیڈر...... یہ عوامی خطاب قائد اعظم کے مقدر کا حصہ تھا اور یہ سعادت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی ۔

Marfat.com

حال میں زِندہ

زندگی کی دوڑ میں دوڑتے ہوئے ذرا رُک کر سوچیں تو پتا چلتا ہے کہ دراصل انسان حال میں زندہ رہتا ہے۔آپ کہیں گے کہ نہیں انسان مال میں زندہ رہتا ہے۔ مال نہ ہو تو مال بنانے میں اور، اگر ہو تو اسے بچانے اور بڑھانے میں مصروف رہتا ہے،لیکن اگر ان مالداروں سے بھی بات کریں تو اندازہ ہوگا کہ دراصل وہ بھی حال ہی میں رہ رہے ہیں۔ ماضی ہم سے کٹ چکا، ماضی محض ایک یاد، حسرت، خواہش، وقتی خوشی اور پچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے، جب کہ مستقبل پردہ راز میں ملبوس ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی کو نظر آتا ہے اور نہ ہی انسان پوری جستجو اور طاقت کے باوجود مستقبل پر حاوی ہوسکتا ہے، چناں چہ وہ مجبوراً حال میں زندہ رہتا اور مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ حال کا ہر لمحہ تیزی سے گزر کر ماضی کی وادی میں داخل ہو جاتا ہے اور جاتے جاتے انسان کو پیغام دے جاتا ہے کہ دراصل زندگی اور دنیا میں کوئی شے بھی مستقل اور پائیدار نہیں، ہر شے گزرتے لمحے کے مانند آنی جانی ہے۔ گویا اصل میں دنیا دارالفنا ہے، جہاں ہر زندگی ہر لمحے فنا ہوتی اور نئی زندگی پاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ گزرتا لمحہ یا گزرا لمحہ ماضی مس فنا ہو چکا اور زندگی جس نئے لمحے میں داخل ہوئی وہ زندہ ہو چکا۔ یہ لامتناہی سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

حال میں زندہ رہنے کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو صرف موجود چیزیں، نظر آنے والے حقائق، رنگا رنگی، عیش و عشرت، شہرت، عہدے اور دولت اچھی لگتی ہے اور وہ ان ہی سے انسانوں کو ماپتا، ان کے قد طے کرتا، ان کا وزن محسوس کرتا اور ان سے متاثر ہوتا ہے۔ ماضی میں کیا تھا، مستقبل کیا خبریں، انقلابات اور تبدیلیاں لے کر آئے گا، اسے حال میں مست انسان سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ آج کا خوب کل ناخوب بن جائے گا، آج کا دھوپ برساتا سورج شام کو غروب ہو جائے گا اور آج

Marfat.com

سامنے ٹہنی پہ کھلا گلاب چند دنوں میں مرجھا جائے گا، انسان نہ ان حقائق پر غور کرتا اور نہ ہی ہر لمحہ زندگی کے مختلف رنگوں کا ادراک رکھتا ہے۔

ایک دوست سے ملاقات ہوئی، تو میں کالج کی زندگی میں واپس لوٹ گیا۔ لگتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے، میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا اور پھر پڑھاتا، حالاں کہ اس حسین حادثے سے سرخرو ہوئے تقریباً 46 برس گزر چکے، یعنی نصف زندگی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔ کالج کی دنیا بھی عام زندگی کے مانند ہوتی ہے، جہاں آپ ہر لمحے اپنے کلاس فیلوز اور کالج فیلوز کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے، جیسے کالج ہی ساری دنیا اور ساری زندگی ہے، بل کہ ساری کائنات ہے، حالاں کہ وہ زندگی اور دنیا کا ایک نہایت چھوٹا حصہ ہوتا ہے، چوں کہ ہماری کل کائنات اس کی چار دیواری تک محدود ہوتی ہے، اس لیے ہمارے لیے وہی کل کائنات ہوتی ہے۔ جوں جوں ہم زندگی میں آگے بڑھتے ہیں، دنیا بدلتی رہتی ہے اور جس مقام پر ہم موجود ہوتے ہیں، وہ مقام ہمیں کل دنیا اور کائنات محسوس ہوتا ہے، کیوں کہ ہم بنیادی طور پر حال میں زندہ رہتے ہیں۔ دراصل یہی زندگی کا فلسفہ ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہوں تو ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے، اس احساس سے جو تصویر بنتی اور ذہن میں اُبھرتی ہے، دراصل یہی ساری زندگی کی تصویر ہے، فقط واقعات اور افراد بدل جاتے ہیں، لیکن حقیقتیں نہیں بدلتیں، مثلاً کالج کی زندگی میں، عام زندگی کے مانند کچھ لوگوں کا بڑا چرچا، بڑا نام اور بڑا رعب داب ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر اچھے مقرر، اچھے لکھاری، اچھے کھلاڑی یا نہایت لائق و فائق طلبا تھے۔ ہزاروں میں ان کی تعداد دو تین درجن ہوتی تھی، چناں چہ کالج کی کائنات میں انھیں نہ صرف شہرت حاصل تھی، بل کہ ''ٹہکا'' تھا، ان کا رعب داب بھی تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جن کالج فیلوز کو ہم اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے اور ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے، عملی زندگی میں ان کا کہیں نام و نشان بھی نہ پایا۔ عملی زندگی کے میدان میں کچھ اور لوگ اُبھرے، کچھ اور لوگوں نے نام اور دام کمایا، شہرت کے اُفق پر چھائے اور معاشرے یا ملک میں معزز اور ذی وقار کہلائے۔ مثلاً کالج کی زندگی میں بورڈ اور یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے والے، پوزیشن لینے والے نہایت اہم اور قابل رشک لگتے تھے، ان میں سے کچھ ڈاکٹر بن گئے، کچھ سائنس دان اور باقی سی ایس پی افسران کی صف میں شامل ہو گئے۔ بات کرنے کا مقصد محض مثال دینا ہے۔ ان لائق و فائق طلبا کے برعکس درمیانے درجے یا کم ترین درجے کے طلبا میں کچھ لوگ سیاست دان بنے اور پھر قوم کے مقدر پر چھا گئے۔ میں نے گزشتہ چالیس برس میں بہت سی

Marfat.com

حکومتیں، کئی اسمبلیاں اور اَن گنت کابینہ بنتے دیکھیں۔تقریباً ہر حکومت، ہر اسمبلی اور ہر کابینہ میں میرے کالج کے عہد کے لوگ نظر آئے، لیکن ان میں ایک بھی چہرہ ایسا نہ تھا جو کالج کے دور میں نام ور، ممتاز یا مشہور رہا ہو۔ممتاز یا نام ور کسی حوالے سے بھی، کسی کارنامے یا کسی کارکردگی کے بنا پر...... میں نے کالج میں پڑھانا شروع کیا تو کلاس میں وہ طالب علم بھی تھے، جنھوں نے بورڈ میں اول، دوم پوزیشنیں حاصل کی تھیں اور وہ بھی تھے، جو کالج کے مباحثوں میں نہ صرف رنگ جماتے، بل کہ بے پناہ داد بھی حاصل کرتے تھے۔ان میں شان دار اداکار اور اچھے لکھاری بھی تھے، لیکن آج عملی زندگی کی دنیا میں ان کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا، سچی بات یہ ہے کہ وہ زندگی کے سمندر میں یوں گم ہوئے ہیں، جیسے لہر سمندر میں گم ہو جاتی ہے، جب کہ حکمران، بڑے سیاست دان، بڑے لکھاری، بڑے کاروباری، بڑے اداکار اور بڑے کھلاڑی عام طور پر ایسے حضرات بنے، جنھیں کالج کی زندگی میں کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ میں اصول کی بات کر رہا ہوں۔اس اصول سے بہت کم لوگوں کو استثنیٰ حاصل ہوتے دیکھا۔گویا کالج کی زندگی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔اسی طرح ہر لحہ بدلتی زندگی کے گزرے کل کا آنے والے کل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔جو کل حکمران تھا، وہ آنے والے وقت میں عتاب کا شکار بھی ہو سکتا ہے، جو آج مال و دولت کے انبار پر بیٹھا ہے، وہ مستقبل میں اس سے محروم بھی ہو سکتا ہے اور جو آج فاقوں مر رہا ہے، وہ آنے والے وقتوں میں دولت مند بھی ہو سکتا ہے۔آج سے چند دہائیاں قبل جو لوگ اقتدار کے نام پر چھائے ہوئے تھے، دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے، بڑے بڑے عہدوں پر قابض تھے یا کھیل اور فلمی دنیا کے حوالے سے بڑے نام ور اور شہرت یافتہ تھے، آج لوگ ان میں سے اکثریت کے نام بھی بھول چکے، کیوں کہ دنیا دار لفنا ہے اور یہاں ہر شے کو فنا ہونا ہے، یہاں کسی شے کو دوام حاصل نہیں۔ انسان اپنی فطرت کے حساب سے حال میں زندہ رہتا ہے اور حال ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے، چناں چہ اسے اقتدار ملے، دولت کا خزانہ ہاتھ لگ جائے، بڑا عہدہ مل جائے، زیادہ شہرت حاصل ہو جائے تو وہ عام طور پر آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور اس کی ہر ادا سے غرور، گھمنڈ اور برتری کا احساس ٹپکنے لگتا ہے۔ یہ مسئلہ صرف ظرف کا نہیں، کیوں کہ میں نے بڑے بڑے ظرف والوں کو بھی بہکتے دیکھا ہے۔ یہ مسئلہ انسانی نفسیات کا ہے، جس کی تعمیر ہی ''حال'' اور ''موجود'' کے اصول پر کی گئی ہے۔ ماضی میں کیا ہوتا رہا، ماضی کتنی بڑی بڑی شخصیات، کتنے بڑے حکمرانوں اور شہرت یافتہ ناموں کا قبرستان بن چکا، اس سے نہ ہم سبق سیکھتے ہیں، نہ ماضی کے قبرستان کی قبروں کے کتبے پڑھتے ہیں، اس لیے ہم اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جیسے ہم تا ابد

Marfat.com

زندہ رہیں گے اور تا ابد اسی طرح رہیں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ انسان حال میں زندہ رہتا ہے اور اسے جو بہ ظاہر نظر آتا یا ملتا ہے، وہی اسی کو زندگی کا حاصل اور سب کچھ سمجھتا ہے، حالاں کہ یہ محض نظر کا دھوکا، نظر کا فریب اور حقیقت میں سراب ہے، لیکن بعض دھوکے اور فریب اس قدر خوب صورت اور دلربا ہوتے ہیں کہ وہ حقیقت ہی لگتے ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ زندگی سب سے بڑا مغالطہ اور موت سب سے بڑا راز ہے۔

Marfat.com

معاملہ ہے بابائے قوم کا، دوستو احتیاط سے کام لو!

احتیاط، ذرا احتیاط میرے دوست! یہ کسی ایرے غیر کا معاملہ نہیں کہ آپ سوچے سمجھے بغیر جو جی میں آئے کہتے چلے جائیں۔ یہ معاملہ بانی پاکستان اور بابائے قوم کا ہے، اس لیے احتیاط اور احترام کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ ہماری قومی بدقسمتی ہے کہ لوگوں میں پڑھنے اور سننے کی عادتیں دم توڑ رہی ہیں، پڑھنے، یعنی مطالعے کی عادت کمزور پڑنے سے غور وفکر کی عادت ختم ہو رہی ہے، جب کہ سننے کی عادت متروک ہونے سے قوت برداشت ختم ہو رہی ہے۔ میری بات پہ یقین نہ آئے، تو کسی بھی ٹیلی ویژن چینل کا نظارہ کر لیجیے، ہر جگہ آپ کو شرکائے پروگرام ایک دوسرے کو للکارتے اور لتاڑتے دکھائی دیں گے۔

جو جی چاہے کہیے، لیکن دوست ذرا احتیاط! کیوں کہ یہ کسی عام سیاست دان کا معاملہ نہیں، بابائے قوم اور بانی پاکستان کے احترام اور تقدس کا تقاضا ہے کہ ان کے بارے میں بات کرنے اور سیاسی فتویٰ دینے سے قبل تھوڑی سی زحمت فرما لیا کریں اور یہاں زحمت سے مراد تھوڑا سا مطالعہ اور تھوڑی سی تحقیق ہے۔ میری اس التجا کے پس پردہ کوئی ذاتی مفاد نہیں سوائے قائداعظم کی محبت کے۔ ہماری نوجوان نسل، ماشاءاللہ درسی کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتی۔ ان کو سارے سیاست دانوں کے بارے میں کنفیوژ کیجیے، لیکن قائداعظم کو معاف کر دیجیے کہ ان کی طفیل ہم آزاد پاکستان میں سانس لے رہے ہیں، اگر ہم صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہو سکے یا پاکستان کو ایک فلاحی اسلامی اور ترقی یافتہ ملک نہیں بنا سکے یا پاکستانی معاشرے کی بنیادیں اسلام کے روشن اصولوں پر استوار نہیں کر سکے، تو اس میں قصور قائداعظم کا نہیں، بل کہ ان کے بعد کی سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور علمی قوتوں کا ہے، جن کی کم مائیگی اور عدم بصیرت نے ہمیں ترقی کی راہ پر ڈالنے کے بجائے دہشت گردی، کرپشن، جھوٹ اور لوٹ کھسوٹ کی قوتوں کے سپرد کر دیا۔

Marfat.com

قائداعظم نے کراچی میں چیمبر آف کامرس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان ایشیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ تمام تر مشکلات کے باوجود ہمارا بجٹ بھی سرپلس ہے اور برآمدات و درآمدات کا پلڑا ہمارے حق میں ہے۔ 67 برس بعد جو صورت حال ہے، وہ آپ کے سامنے ہے اور تبصرے کی محتاج نہیں۔ مذہب سے نالاں سیکولر دانش وروں کو خدا موقع دے۔ فرماتے ہیں بنگلہ دیش نے سیکولرازم کو اپنا کر ترقی کی ہے۔ میں بنگلہ دیش میں قیام کے دوران مشاہدے اور مطالعے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ بنگلہ دیش کی برآمدات اور ٹیکسٹائل میں ترقی کا راز قومی جذبے اور حکومتی پالیسیوں میں مضمر ہے۔ ہم بیرونی و اندرونی قوتوں کی مہربانی سے دہشت گردی کا شکار ہو کر عدم استحکام میں مبتلا ہو چکے ہیں، اس کے باوجود ہم معاشی طور پر آگے بڑھتے رہتے، اگر بجلی کے بحران کا نشانہ نہ بنتے۔ موجودہ حکومت کی کوششوں نے امید کی شمع روشن کی ہے۔ یہ توقع کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ آیندہ چند برسوں میں بجلی بحران پر قابو پا لیا جائے گا۔

بات دُور نکل گئی۔ مقصد یہ عرض کرنا تھا کہ خدا کے لیے ہر سیاست دان کو جو جی چاہے کہیے کہ آپ کا جمہوری حق ہے، لیکن قائداعظم کو معاف کر دیجیے کہ وہ بانی قوم و ملک تھے اور ان جیسا مخلص، سچا اور صاحب کردار لیڈر کم قوموں کو نصیب ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی جائیداد کا معتدبہ حصہ علی گڑھ یونیورسٹی، اسلامیہ کالج پشاور اور سندھ مدرسۃ الاسلام کو دے دیا، لیکن نہ اس کی تشہیر کی اور نہ ہی کبھی زندگی میں یہ خبریں شائع کروائیں کہ وہ ٹوکن تنخواہ لیتے تھے اور قومی خزانے پر بہت معمولی بوجھ ڈالتے تھے۔ ان ساری باتوں کا علم ان کی وفات کے بعد ہوا، جب کہ ان کے جانشینوں اور ہمارے سیاسی لیڈروں کا سارا زور ذاتی تشہیر پر رہا ہے۔

مقصد یہ عرض کرنا بھی تھا کہ خدارا قائداعظم کے بارے میں کوئی سیاسی فتویٰ دینے سے قبل تھوڑی سی تحقیق کر لیا کریں تا کہ آپ تاریخ کو مسخ کرنے کے مجرم نہ ٹھہریں۔ گزشتہ دنوں ایک دانش ور نے لکھا کہ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کی سربراہی اور ملک کی سربراہی، یعنی دونوں عہدے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ یہ جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عملاً قائداعظم قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی سیاست سے الگ ہو گئے تھے۔ اگست سے لے کر دسمبر تک مسائل نے ان کو سر اُٹھانے کی مہلت نہ دی، اس کے باوجود انھوں نے دسمبر 1947ء میں کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس بلایا، جس میں پاکستان اور ہندوستان کے لیے الگ الگ مسلم لیگیں معرض وجود میں آئیں۔ کونسلروں کے اصرار کے باوجود قائداعظم

Marfat.com

نے پاکستان مسلم لیگ کا صدر بننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ملک کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے، وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہوں گے۔ یہ ساری سبق آموز تفصیل میری کتاب ''مسلم لیگ کا دور حکومت'' میں موجود ہے۔ ذرا فرصت ملے تو اسے پڑھیں کہ تاریخ کے مطالعے سے روشنی ملتی ہے۔

کچھ عرصے قبل ایک کالم نگار نے لکھا کہ قائداعظم کی 11 اگست 1947ء والی تقریر کو کئی سال چھپنے نہ دیا گیا۔ میں یہ افسانہ پڑھ کر شرمندگی سے شرابور ہو گیا۔ قائداعظم، قائداعظم تھے، بھلا یہ کس کی مجال کہ ان کی تقریر کو شایع ہونے سے روک دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تقریر کے چند فقروں پر کچھ حضرات کو اعتراض تھا۔ انھوں نے وزارت اطلاعات کے ذریعے ان فقروں کو حذف کروانے کی آرزو کی۔ جب یہ معاملہ ڈان کے الطاف حسین تک پہنچا تو انھوں نے جواباً کہا میں ابھی اس جسارت کی خبر قائداعظم کو دیتا ہوں، پھر یہ ہوا کہ وہ حضرات جھاگ کے مانند بیٹھ گئے۔ اگلے روز یہ مکمل تقریر اخبارات میں چھپی۔ ایسٹرن ٹائمز کا 12 اگست 1947ء کا پرچہ ملاحظہ فرمائیے۔ تقریر کا مکمل متن موجود ہے اور خورشید یوسفی مؤلف تقاریر قائداعظم نے، وہیں سے لے کر اسے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ دستور ساز اسمبلی کی کارروائی میں بھی یہ تقریر من و عن موجود ہے، جسے یاسر پیرزادہ نے مجھے بھجوایا ہے۔

11 اگست کی تقریر کے حوالے سے روشن خیال اور سیکولر حضرات مسلسل کچھ نہ کچھ انکشاف کرتے رہتے ہیں۔ وہ نہ ہی میثاق مدینہ کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی انھوں نے قائداعظم کی 11 اگست سے پہلے اور بعد والی تقاریر پڑھی ہیں۔ بلاشبہ اسلام مذہبی اقلیتوں کو تمام تر حقوق اور ہر قسم کی ریاستی سرپرستی فراہم کرتا ہے اور ان اصولوں سے انحراف کرنے والوں کا اپنا اپنا ایجنڈا ہے، جس کا اسلام کی سچی روح سے کوئی تعلق نہیں۔

گزشتہ دنوں ایک دانش ور نے اپنے کالم میں لکھا کہ قائداعظم نے کبھی اسلامی ریاست کا ذکر نہیں کیا۔ مجھے ان دانش وروں سے صرف یہ شکایت ہے کہ وہ قائداعظم کی تقاریر کو پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے اور اپنی خواہشات کو قائداعظم کا خواب بنا دیتے ہیں۔ قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل 101 بار اور بعد ازاں چودہ بار یہ کہا کہ پاکستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ اس کا ہرگز مطلب نہ مذہبی ریاست ہے اور نہ ہی ملاّ ازم۔ وہ ایک روشن خیال ترقی یافتہ اسلامی جمہوری ریاست کا خواب دیکھتے تھے، جس میں انسانی مساوات، معاشی انصاف اور قانون کی حکمرانی ہو گی اور جہاں طبقاتی استحصال، جاگیرداری، کرپشن، فرقہ واریت اور ناانصافی کا نام و نشان نہیں ہو گا۔ اسلامی جمہوری ریاست میں مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے اور ریاست ہرگز مذہب

Marfat.com

مسلط نہیں کرتی، یہی قائداعظم کا خواب تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ قائداعظم نے کبھی اسلامی ریاست کا نام نہیں لیا، انھوں نے تو فروری 1948ء میں امریکی عوام کے نام پیغام میں پاکستان کو پریمیر اسلامی ریاست قرار دیا تھا۔ میں تحقیق سے ثابت کر چکا ہوں کہ قائداعظم نے کبھی جگن ناتھ آزاد سے نہ ملاقات کی اور نہ ہی قومی ترانہ لکھوایا۔ اس کے باوجود ہمارے دانش ور جھوٹ پر اصرار کرتے ہیں۔ میری ان سے گزارش ہے کہ دوستو احتیاط۔ ذرا سی احتیاط کہ یہ قائداعظم کا معاملہ ہے۔ خدارا قائداعظم کو معاف کر دو، وہ بانی پاکستان اور بابائے قوم تھے۔ ان کے مقام اور احترام کا خیال لازم ہے۔

Marfat.com

ایک یاد ـــــ ایک بات

جنگ یمن کے سبب سعودی عرب ہر لمحہ خبروں میں تھا، تو مجھے ایک ذاتی مشاہدہ یاد آتا رہا۔ میرا ایک نیم مجذوب فقیر دوست، جسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے تقریباً پینتس (35) حج اور لاتعداد عمرے نصیب کیے، کہا کرتا تھا۔ سارا سعودی عرب ہی حرم شریف ہے۔ اس سرزمین پر اُترتے ہی اپنے آپ پر وہ ادب لازم کرلو۔ یہ تو ہیں عاشقوں کی باتیں، لیکن ہم جیسے عام پاکستانیوں کے لیے بھی سعودی عرب اس قدر مقدس ملک ہے کہ ہمیں اس کا استحکام، وجود اور یکجہتی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ یوں بھی ہم ہندو پاکستان کے مسلمان اسلام کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی جذباتی واقع ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جنگ عظیم اول کے بعد ترکی کی خلافت کے لیے سب سے بڑی تحریک ہندوستان میں چلی اور ایک محقق کے مطابق بیس ہزار افراد پابند سلاسل ہوئے۔ ابھی خواتین اپنے جسموں سے زیورات اُتار کر دے رہی تھیں کہ مصطفیٰ کمال نے خلافت ہی ختم کردی۔ دنیا کے کسی اور مسلمان ملک میں نہ اتنی طاقت ور تحریک برائے خلافت چلی اور نہ ہی اتنی عظیم قربانیاں دیکھنے میں آئیں، حالاں کہ ہم بھی اس وقت انگریزوں کے غلام تھے اور مسلمان ممالک کی اکثریت ہماری طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔

ہاں تو میں عرض کررہا تھا کہ سعودی عرب کی محبت اور عقیدت ہمارے جسم اور روح میں بسی ہوئی ہے اور مشام جاں کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سعودی ہمیشہ ایک احساس تفاخر یا برتری میں مبتلا رہے ہیں۔ خاص طور پر تیل کی دریافت اور پیٹرو ڈالر کی خوشحالی نے ان کے احساس برتری میں مزید اضافہ کردیا ہے، جب کہ پاکستان کی غربت اور لاکھوں پاکستانیوں کی سعودی عرب میں معمولی ملازمتیں حاصل کرنے کی دوڑ نے سعودیوں کی نظروں میں پاکستانیوں کی

Marfat.com

معیشت ''مسکین'' اور قابل رحم بنا دی ہے۔ بے شمار واقعات کا ذکر نہ کرنا ہی مناسب ہے، بس ایک واقعہ سن لیجیے۔ وزیر آباد سے تعلق رکھنے والے ایک معلم طوسی صاحب نے قائداعظمؒ کی توجہ سے شہرت پائی، کیوں کہ قائداعظم نے ان کی ''انگریزی دانی'' اور پاکستان کے حق میں لکھے گئے مضامین سے متاثر ہو کر انھیں اپنے پاس بمبئی بلایا اور کئی ہفتے اپنی لائبریری میں بٹھایا۔ ان طوسی کے صاحبزادے ایک نہایت کوالیفائیڈ اور قابل ڈاکٹر تھے اور لندن میں رہایش پذیر تھے۔ شاید اسی کی دہائی میں وہ لندن سے ہجرت کر کے جدہ آ گئے۔ وہاں اپنا ہسپتال قائم کیا اور اس قدر نام پایا کہ شاہی طبیبوں میں شمار ہونے لگے۔ سعودی بادشاہ اور ان کے خاندان کے ساتھ مرحوم طوسی صاحب کا ذاتی تعلق قائم ہو گیا تھا۔ وہ میرے مہربان تھے اور بہت شفقت فرماتے تھے۔ غالباً 1991ء میں، میں عمرے کے لیے گیا تو جدہ میں اپنے عزیز دوست پروفیسر ظفر علی احسن مرحوم کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر طوسیؔ صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئی اور بے شمار تجربات و مشاہدات سننے کا موقع ملا۔ ایک دن میں تنہا دوپہر کے کھانے پر ان کے ہاں مدعو تھا۔ ڈاکٹر طوسی صاحب نے تجربات کی پوٹلی کھولی اور بتایا کہ آج سے بہت برس پہلے جب میں انگلستان سے ہجرت کر کے جدہ آیا، تو سامان چھڑانے کسٹم افسران کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مرحوم طوسی صاحب ماشااللہ گورے چٹے اور بہ ظاہر انگریز لگتے تھے۔ کسٹم افسران نے برطانیہ سے آئے ہوئے انگریز کے مانند ان کی آؤ بھگت کی اور دفتر میں بٹھا کر خاطر مدارت کی، پھر کہا کہ آپ سامان لے جائیں چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے پاسپورٹ مانگا گیا۔ پاکستانی پاسپورٹ دیکھتے ہی افسران کا رویہ پل بھر سے بھی کم میں بدل گیا۔ حکم ہوا ان کے سامان کا کنٹینر کھولا یا جائے اور اچھی طرح تلاشی لے کر جانے دیا جائے۔ اس فوری تبدیلی اور رویے کا جواز یہ کہہ کر دیا جا سکتا ہے کہ ہم پاکستانیوں نے بڑی ''محنت'' سے یہ مقام اور اعزاز کمایا ہے اور ہم دنیا کے جس ایئرپورٹ یا بندرگاہ پر بھی اتریں ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس وقت تک مجرم سمجھا جاتا ہے، جب تک ہم اپنے آپ کو معصوم ثابت نہ کر دیں۔ وجوہ اچھی طرح معلوم، بحث لاحاصل۔

1998ء میں ایٹمی دھماکے کے بعد چند ماہ۔ صرف چند ماہ...... کے لیے عالم اسلام میں بہ ظاہر ہمارے وقار میں اضافہ ہوا۔ میں ان دنوں اسلامی ممالک کی ممتاز تنظیم آئی سسکو کی مجلس انتظامیہ کا منتخب رکن تھا۔ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں اجلاس کا دعوت نامہ ملا، تو خیال آیا کہ میٹنگ کے بعد عمرے کی سعادت بھی نصیب ہو جائے گی۔ ریاض ایئرپورٹ پر جہاز سے نکلا تو پاکستانی سفیر محترم خالد

Marfat.com

محمود صاحب سعودی پروٹوکول کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔ میں نے ایک چھوٹا سا بریف کیس اٹھا رکھا تھا، جسے ایک سعودی اہلکار نے لینا چاہا تو میں نے عادتاً کہا کہ اپنا بریف کیس اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس نے بہ ہر حال مجھ سے بریف کیس لے لیا اور میری سرکاری گاڑی میں رکھ دیا۔ کچھ پاکستانی حضرات یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے دو تین حضرات اگلے دن ملنے آئے تو کہنے لگے ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے سعودیوں کو اپنا بریف کیس اُٹھانے دیا کیجیے، یہ شلوار والوں کو بہت کم تر سمجھتے ہیں۔ میں شعبہ تعلیم سے وابستہ ان ہم وطنوں کو جانتا نہیں تھا، بس مسکرا کر رہ گیا۔ کئی برس گزر گئے، لیکن اس بات کو بھول نہیں سکا، کیوں کہ ذاتی حیثیت میں عمروں کے دوران اس کی یاد ہر بار تازہ ہوتی رہی۔

تین چار دن میٹنگ جاری رہی۔ ایک دن بعد از دوپہر ریاض یونیورسٹی کی طرف سے چھوٹا سا استقبالیہ تھا۔ یونیورسٹی یاترا کے بعد سر سبز لان میں چائے کے لیے گئے تو نہایت خوب صورت اور وجیہہ نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ریاض یونیورسٹی کے سائنس کے کسی شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ میرے ساتھ ایک پروفیسر صاحب سرکاری ڈیوٹی کے حوالے سے وابستہ تھے۔ ان کا نام پروفیسر ابراہیم تھا، نہایت خوش مزاج اور کھلی طبیعت کے مالک تھے، چناں چہ ان سے اُنس کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر میرا اس خوب صورت اسسٹنٹ پروفیسر سے تعارف کروایا اور بتایا کہ ان صاحب کا تعلق حضور نبی کریمؐ کے خاندان سے ہے۔ میں نے فوراً انھیں گلے لگا لیا اور چند منٹ تک دل سے دل ملانے کی کوششیں کرتا رہا۔ پروفیسر ابراہیم ہمارے لیے چائے لینے چلے گئے اور میں ان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبائے باتیں کرنے لگا۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا کہ مجھے پاکستان بہت عزیز ہے۔ آپ میرا وزیٹنگ کارڈ لیں اور پاکستان سے میرے شعبے میں چند ایک پی ایچ ڈی حضرات کے سی وی بھیجیں۔ میں انھیں اپنی یونیورسٹی میں ملازمت دوں گا۔ وہ خود بھی کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی تھے۔ وطن لوٹا تو اس شعبے سے متعلق حضرات کی تلاش کی، سرکاری طور پر بھی درخواستیں مانگیں، لیکن کامیابی نہ ہوئی، کیوں کہ یہاں اس شعبے کا کوئی پی ایچ ڈی تھا ہی نہیں۔ میرے نزدیک اس وزٹ یا دورے کا حاصل ان صاحب سے ملاقات، معانقہ اور محبت بھری چھپی تھی، جن کا تعلق ہمارے نبی کریمؐ کے خاندان سے ہے۔ میں ان سے باتوں کے دوران سوچتا رہا کہ نورِ نبیؐ یوم اول سے یوم آخر تک موجود ہے۔ کوئی ایک آدھ ذرہ تو ان کے خون میں بھی پوشیدہ ہوگا؟ سیکولر اور روشن خیال اسے تو ہم پرستی کہیں گے۔ کہنے دیجیے کہ ان کا علم انھیں یہی سکھاتا ہے۔ میں ان کی کتاب میں عقیدت کا باب ہی موجود نہیں، جب کہ ہماری کتاب ادب سے

Marfat.com

شروع ہوکر ادب پر ختم ہوتی ہے۔ بابا مست کہا کرتا تھا با ادب با مقصود۔ بے ادب سے بے مقصود اب اس کہانی کے انجام کی طرف بڑھتا ہوں۔ سرکاری دورے کا آخری دن تھا اور تمام شرکا کے اعزاز میں شاہی محل میں ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نہایت وسیع وعریض، خوب صورت اور جگمگاتے ڈائننگ ہال میں ہم قیمتی ترین میزوں کرسیوں پر بٹھائے گئے۔ میرے ساتھ سعودی پروفیسر ابراہیم تھے، جن سے تھوڑی سی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ کھانے کی میزیں، ہر قسم کے کھانوں سے بھری ہوئی تھیں اور شرکا پر ایک رعب سا طاری تھا۔ میں نے پروفیسر ابراہیم کو چھیڑنے کے لیے کہا کہ ابراہیم یہ مکھن شاید سویڈن کا ہے۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مرعوب کرنے کے لیے چھوٹی سی تقریر کر ڈالی۔ کہنے لگا ہاں! یہ مکھن سویڈن کا ہے، کری ساں اور سیب فرانس کے ہیں، کیلے، دودھ اور خشک میوے امریکا کے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے شرارتاً پوچھا ان میں کوئی شے سعودی بھی ہے یا نہیں؟ وہ رعب جمانے کے موڈ میں تھا کہنے لگا ڈاکٹر صفدر! سعودی عرب ایک امیر ملک ہے، ہم دنیا بھر سے بہترین اشیا منگواتے اور کھاتے ہیں...... اس کی گفتگو میں ایک ہلکی سی بالواسطہ طنز تھی، پاکستان کی غربت پر، جسے میں نے محسوس کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا پروفیسر ابراہیم بلاشبہ تمھارا ملک دولت سے مالا مال ہے اور دنیا بھر سے بہترین اشیا درآمد کر سکتا ہے۔ کیا تم ایٹم بم بھی درآمد کر سکتے ہو؟ وہ جھینپا تو میں نے عرض کیا کہ بھائی جب صدر صدام حسین نے تمھیں آنکھیں دکھائیں اور ڈرانے کے لیے میزائل پھینکا تو سعودی عرب کو کون یاد آیا اور کسے دفاع کے لیے بلایا؟ وہ کھسیانی ہنسی ہنسا اور دھیمے سے کہا ''پاکستان'' پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

Marfat.com

جعل ساز

چند برس قبل کی بات ہے کہ میں شام کے وقت ایک مہمان کو رخصت کرنے کے بعد گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اتنے میں سائیکل موٹر پر سوار دو نوجوان لڑکے میرے پاس آ کر رُکے۔ پیچھے بیٹھا ہوا نوجوان سائیکل موٹر سے اُتر کر نہایت مؤدب انداز سے میرے قریب آیا۔ اس نے گردن میں لاہور کی ایک معروف پرائیویٹ یونیورسٹی کا شناختی کارڈ لٹکا رکھا تھا۔ کہنے لگا ''سر میں اس یونیورسٹی میں بی کے فائنل سمیسٹر کا طالب علم ہوں، یتیم ہوں اور کوئی ذریعہ آمدنی نہیں۔ کچھ خدا ترس لوگ میرا خرچ برداشت کرتے ہیں۔ فیس ادا کرنے کی آخری تاریخ پرسوں ہے۔ اگر ادا نہ کی تو نام کٹ جائے گا اور امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ سمیسٹر ضائع ہو جائے گا۔ سر پلیز میری مدد کیجیے۔ میں اس کی داستان محرومی و غم سن کر متاثر ہوا اور پوچھا فیس کتنی ہے۔ بولا 23 ہزار ہے۔ میں نے جواباً کہا کہ بیٹا اتنی رقم تو میں ادا نہیں کر سکتا۔ بولا آپ نصف دے دیں۔ باقی کا انتظام میں کر لوں گا۔ آپ چاہیں تو کرنل صاحب سے میری تصدیق کر لیں۔ وہ میرے خرچے کا تھوڑا سا بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ میں نے اسے نصف فیس ادا کر دی اور دعا دے کر رخصت کر دیا۔ دوسرے دن شام کو موبائل کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف سے آواز آئی میں بریگیڈیئر ڈاکٹر اعجاز قریشی بول رہا ہوں۔ کل آپ کے پاس جو یتیم طالب علم آیا تھا، ہم بھی اس کی مدد کرتے ہیں اور میں تصدیق کر رہا ہوں کہ وہ مستحق ہے۔ چند فوجی افسران نے مل کر این جی او بنائی ہوئی ہے، جو یتیم طالب علموں اور مریضوں کی مدد کرتی ہے۔ ہمارا دفتر ٹاؤن شپ لاہور میں ہے۔ ہم کافی عرصے سے اس طالب علم کی بھی کچھ نہ کچھ مدد کرتے ہیں۔ ہمارے میجر صاحب خود یونیورسٹی میں فیس جمع کروانے جاتے ہیں، کیوں کہ ہم طالب علموں کو کیش نہیں دیتے۔ بات لمبی ہوئی، لیکن میں مختصر کر رہا ہوں۔

Marfat.com

دو دن بعد بریگیڈیئر ڈاکٹر صاحب کا پھر فون آیا۔ایک یتیم بچی جو حافظ قرآن ہے۔کینسر کے مرض میں مبتلا ہے اور شوکت خانم ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ میں ابھی اسے ہسپتال میں دیکھ کر اور اس کے معالجوں سے مل کر آیا ہوں۔اسے خون کی اُلٹیاں آرہی ہیں۔ڈاکٹروں نے جو انجکشن تجویز کیا ہے اس کی قیمت ساڑھے بارہ ہزار روپے ہے اور یہ انجکشن بیس روز لگنا ہے۔ڈاکٹر صاحب ہمارے وسائل کم ہیں۔آپ کچھ ٹیکوں کے پیسے دے دیں۔اس بچی کا والد امام مسجد تھا، وفات پا چکا۔اس کا بھائی حافظ عمران آپ کے پاس آئے گا۔حافظ عمران بچوں کو قرآن مجید پڑھا کر ساڑھے آٹھ ہزار کماتا ہے، جس سے بہ مشکل گزارہ کرتا ہے۔آپ اسے آٹھ نو ٹیکوں کے پیسے دے دیں۔میں نے جواباً عرض کیا کہ بھائی اتنے تو مشکل ہے، کہنے لگے آپ جتنا بھی کر سکیں کر دیں۔شام کے وقت ایک نوجوان آیا، جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔اس نے بڑی محنت کر کے یتیم سی شکل بنا رکھی تھی۔ ہاتھ ملا کر بتایا کہ میں حافظ عمران ہوں۔بریگیڈیئر ڈاکٹر اعجاز صاحب نے بھیجا ہے۔ بہنا (بہن) کو خون کی قے ہوئی ہے۔ایک انسانی جان کے ضیاع کے خیال سے میرا دل پسیج گیا اور عاقبت میں سرخروئی کے خیال سے اسے پانچ ٹیکوں کی قیمت ادا کر دی۔چار دن گزرے، تو بریگیڈیئر صاحب نے پھر کال کیا۔ٹیکوں کے لیے پیسوں کا انتظام نہیں ہو رہا۔کچھ مزید مدد کر دیں، ورنہ بچی مر جائے گی۔ایک بار پھر دل پہ چوٹ لگی اور رحم کا جذبہ غالب آگیا۔مزید پانچ انجکشنوں کی رقم ادا کر دی۔دس ٹیکے لگنے کے بعد بریگیڈیئر صاحب نے پھر کال کیا اور یہ خوشخبری سنائی کہ بچی ماشاءاللہ خاصی بہتر ہے۔خون کی اُلٹیاں بند ہوگئی ہیں۔باقی ماندہ پانچ ٹیکوں کے پیسے ہم نے اکٹھے کر کے اسے دے دیے ہیں۔مزید چھ سات روز گزر گئے۔اس دوران بریگیڈیئر صاحب میری خیریت بھی پوچھتے رہے اور اپنی انسانی خدمات کا ذکر بھی کرتے رہے۔ایک بار مجھ پر احسان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم غریب و بے سہارا بچیوں کی شادیاں بھی کرتے ہیں، اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مستحق کیس ہو تو مجھے بتایئے گا، پھر ایک روز ان کا فون آیا کہ ڈاکٹروں نے تاکید کی ہے کہ بچی کو مزید ایک درجن ٹیکے لگوائیں، کیوں کہ اسے پھر خون کی الٹی آئی ہے۔خطرہ ہے کہ خون کی اُلٹیاں دوبارہ شروع نہ ہو جائیں۔اس بار پھر انھوں نے میرے دل پر حملہ کیا، جذبہ رحم اُبھارا اور مجھ سے پھر نو ٹیکوں کی قیمت وصول کر لی۔لمبی کہانی کو اختصار میں ڈھالتے ہوئے اتنا عرض کروں گا کہ میں نے اپنے خاندان، دوستوں اور دیگر احباب سے مدد مانگ مانگ کر ایک یتیم حافظہ کی جان بچانے کے لیے چار لاکھ سے زیادہ کی رقم حافظ عمران کو دی۔ایک دن جذبہ رحم پر عقل غالب آئی، تو میں نے اس سے سوال و جواب کرنے

Marfat.com

شروع کیے اور ڈاکٹر بریگیڈیئر صاحب کی شناخت مانگی۔اس کے جواب میں بریگیڈیئر صاحب کا پھر فون آیا، میری تسلی کے لیے اپنا وزٹنگ کارڈ بھجوادیا، جو میرے پاس محفوظ ہے۔ بے وقوف بننے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میرے شبہات زور پکڑ گئے تو اپنے سابق سرکاری وسائل استعمال کر کے میں نے حافظ عمران اور بریگیڈیئر اعجاز اور ان کے دیگر ساتھیوں کے فون نمبر ایک ایجنسی کو دیے۔ انھوں نے ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے ان کے اصل نام، شناختی کارڈ نمبر اور ایڈریس مہیا کر دیے۔ حافظ عمران نے مجھے بہن کی خونی قے کا دباؤ ڈال کر مزید رقم کے لیے فون کیا، تو میں نے چھوٹتے ہی کہا کہ تمھارا اصل نام یہ ہے، تمھارا شناختی کارڈ نمبر یہ ہے اور تم ضلع خوشاب کے فلاں گاؤں کے رہنے والے ہو۔ وہ ایک دم ڈھیر ہو گیا اور خدا رسول کے نام پر معافیاں مانگنے لگا۔ اس نے بتایا کہ ہمارا ایک گینگ ہے جس کا کام ہی انسانی ہمدردی کے نام پر لوگوں کی جیبوں پر ڈاکے ڈالنا ہے۔ آپ نے، اگر پولیس رپٹ کر دی تو میں بدنامی کے ڈر سے خود کشی کرلوں گا۔ میں نے آپ کی دی گئی رقم کے اپنے حصے سے دو بھینسیں خریدی ہیں۔ اب ان کا دودھ فروخت کر کے روزی پیدا کروں گا۔ میرا وعدہ ہے کہ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ میری بیوی اور چھوٹے سے بچے پر رحم کھاتے ہوئے، مجھے معاف کر دیں۔ اب میں رزق حلال کماؤں گا۔ میں نے اسے معاف کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا اصل نام نہیں لکھا۔ بزرگ کہتے ہیں انتقام لینے سے معاف کر دینا بہتر ہے۔ غلطی کرنا، دھوکا کھانا اور نقصان اُٹھانا اصل گھاٹا نہیں، اصل نقصان اس سے سبق نہ سیکھنا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص نے میرا جذباتی استحصال (Emational Black Mail) کیا۔

پھر ایک روز موبائل بجا تو چند عورتوں کے رونے دھونے کی دل پگھلانے والی آوازیں سنائی دیں۔ بتایا گیا کہ ہم ابھی پمز ہسپتال اسلام آباد سے میت لے کر ایمبولینس سے گاؤں جا رہے ہیں۔ کرایہ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں، یہ ڈرائیور سے بات کریں۔ ڈرائیور نے اس سانحے کی تصدیق کی۔ میں نے اسلام آباد میں ایک مہربان کو فون کیا اور داستان غم سنائی۔ ارادہ تھا، اگر تصدیق ہو جائے تو مدد کی صورت نکالی جائے۔ انھوں نے نصف گھنٹے کی تحقیق کے بعد جواب دیا جو کچھ کہا گیا اور جو کچھ آپ نے سنا، وہ افسانہ تھا۔ آج پمز سے اس وقت تک کوئی ڈیڈ باڈی (میت) نکلی ہی نہیں۔ چند ہفتوں کے وقفے کے بعد ایک صاحب نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے موبائل پر بتایا کہ میں چلڈرن ہسپتال سے فلاں ڈاکٹر بول رہا ہوں۔ ایک غریب بچے کے علاج کے لیے آپ کو فون کیا ہے۔ میں نے طبیعت پر جبر کر کے معذرت کر لی اور پھر چلڈرن ہسپتال سے پتا کیا تو راز کھلا کہ اس نام کا وہاں کوئی ڈاکٹر ہی نہیں۔ اب مجھے احساس ہوا

Marfat.com

کہ مجھے جعل سازوں کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو فروخت کر دیا ہے، جس طرح بدمعاش، بھتہ خور اور بھکاریوں کے گروہ اپنے علاقے بیچتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کئی وارداتیوں نے مجھ پر انسانی ہمدردی کے حملے کیے لیکن ناکام رہے۔ اب تو میں پہلا فقرہ سن کر ہی فون بند کر دیتا ہوں۔ یہ ساری رام کہانی سنانے کا مقصد فقط یہ تھا کہ تصدیق کیے بغیر کبھی مدد نہ کریں۔

یہاں تک لکھ چکا ہوں تو معذرت کے ساتھ ایک سوال پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کیا جعل سازی، دھوکا دہی اور مکر و فریب میں کوئی قوم ہمارا مقابلہ کر سکتی ہے، کیا اس میدان میں ہمارا کوئی ثانی ہے؟

Marfat.com

جعل ساز II

کہتے ہیں غلطی اور تجربہ بہترین اُستاد ہوتے ہیں۔ میں اس قول میں فقط، اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ یہ بہترین استاد ہوتے ہیں شرط یہ ہے کہ ان سے سبق سیکھا جائے۔ جس طرح سکول میں استاد کو پڑھائے گئے سبق کو یاد نہ کرنے والے طالب علم نالائق کہلواتے ہیں، اسی طرح زندگی کی غلطیوں اور تجربات سے سبق نہ سیکھنے والے بھی بار بار غلطیاں دہراتے، صدمات اور نقصانات اُٹھاتے رہتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے تجربات کو آپ سے شیئر کرنے کا مقصد آپ کو انتباہ کرنا اور تھوڑی سی ذہنی تربیت کرنا ہوتا ہے تاکہ آپ وارداتیوں کی ہوس اور مکروفریب کا نشانہ نہ بنیں، ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ جو کام بھی رضائے الٰہی اور اپنے رَبّ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے، اس کا اجر فوراً مل جاتا ہے اور نیت کے ساتھ ہی وہ نیکی نامہ اعمال میں شامل ہو جاتی ہے۔ انسان کسی دھوکے یا فراڈ کا شکار ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ ہمیں جزا اور پھل ہماری نیت کا ملے گا اور دھوکا دینے والے کو سزا اس کے عمل کی ملے گی۔ میری بھی نیت آپ کو اپنے تجربے کی بنا پر دھوکے، فریب اور فراڈ سے بچانے کی ہے، کیوں کہ میں اخلاقی تنزل کے عمل کو تیزی سے سفر طے کرتے دیکھ رہا ہوں اور شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں سچ اور جھوٹ، اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی، اصل اور نقل کے درمیان فرق مٹ رہا ہے۔ اس لیے میں سیاست کے بجائے معاشرے اور قومی رویوں پہ لکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ان تجربات کو آپ سے شیئر کرتے ہوئے، اگر کہیں ذاتی پہلو اجاگر ہوتا ہو تو یقین رکھیے کہ یہ ہرگز میری نیت نہیں۔ میری نیت خود احتسابی اور قومی کردار کا احتساب ہے۔ بلاشبہ یہ میدان یا شعبہ سمندر کے مانند وسیع ہے، لیکن پھر بھی جتنا اور جس قدر ہو سکے، اسی قدر قومی فرض نبھانے میں کیا حرج ہے۔

Marfat.com

کسی زمانے میں اٹلی کا خوب صورت شہر روم جیب تراشی کے لیے مشہور تھا۔ نظر بد دور اب پاکستان جعل سازی کے لیے شہرت کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ دہشت گردی سے تو انشاء اللہ ہم نجات حاصل کرلیں گے، لیکن جعل سازی سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بیرون ملک پاکستانیوں نے اپنی قابلیت اور خدمات کے جھنڈے گاڑے ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایسے پاکستانی حضرات کی بھی کمی نہیں، جو جعل سازی کے فن میں طاق ہیں۔ بدقسمتی سے لوگ اچھے کارناموں کو اگنور کر دیتے ہیں، لیکن جعل سازی کی حرکات کو قومی کردار کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ بہ ہر حال تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے، میں آپ کو چند ایک تجربات کی جھلک دکھانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

آج کل میں لاہور کی ایک اُبھرتی ہوئی پرائیویٹ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں اور اس یونیورسٹی کا نام لاہور لیڈز یونیورسٹی ہے۔ میرا سارا فوکس معیارِ تعلیم یعنی کوالٹی ایجوکیشن پر ہے، اس لیے ہمیں اچھے اساتذہ کی تلاش رہتی ہے۔ چند ماہ قبل ایک اہم مضمون کے لیے ایک سی وی موصول ہوا۔ ان پروفیسر صاحب کا پندرہ سالہ تجربہ درس و تدریس کا تھا اور وہ انگلستان کی ایک ممتاز یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی تھے۔ ہم نے وقت ضائع کیے بغیر ان سے ملاقات کی اور مختصر سارسمی انٹرویو کرنے کے بعد انھیں ڈیڑھ لاکھ روپے پر رکھ لیا اور ساتھ ہی معمول کے مطابق عرض کی کہ اپنی ڈگریاں ایچ ای سی سے تصدیق کروا کر دیں۔ ڈیڑھ ماہ کے بعد پتا چلا کہ ابھی انھوں نے تصدیق شدہ ڈگریاں نہیں بھجوائیں۔ ہم نے براہ راست انگلستان میں ان کی یونیورسٹی کو ای میل بھجوائی اور ان سے ڈگری کی تصدیق کے لیے درخواست کی۔ تین دن کے بعد جواب آیا کہ اس نام کا کوئی طالب علم کبھی ہماری یونیورسٹی میں داخل نہیں ہوا۔ ان پروفیسر صاحب کو ہماری ''گستاخی'' کی بھنک پڑ گئی اور وہ تنخواہ لے کر غائب ہو گئے۔ میں اس سانحے، ہاں! سانحے پر دکھ کا اظہار کر رہا تھا، تو ایک پروفیسر صاحب نے خوب تبصرہ کیا۔ کہنے لگے ''استاد، والدین، اراکین اسمبلیاں و سینٹ، دانش ور حکمران اور اہم سیاست دان معاشرے کے رول ماڈل ہوتے ہیں، جب یہ طبقے جعل سازی اور کرپشن کے مرتکب ہوں، تو پھر نوجوان نسلوں کو محض لیکچروں سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ کردار سازی ''وعظوں'' سے نہیں اعمال اور عملی نمونوں سے ہوتی ہے۔ استادوں سے لے کر طالب علموں تک تحقیق کے نام پر نقل کا سلسلہ جاری ہے، حصول علم کے بجائے آسان ڈگری کا حصول مقصد بن چکا ہے۔ جعلی ڈگریاں، جعلی علم، جعلی کردار پیدا کر رہی ہے''۔ میں ان کی بات سن کر سوچ کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگا۔

Marfat.com

جعلی تحقیق سے یاد آیا کہ 2004ء میں مجھے مسلم لیگ (ق) کی ایک اہم سیاسی عہدیدار خاتون کا فون آیا کہ وہ ملنا چاہتی ہیں۔ جنرل مشرف کا دور حکومت تھا اور مسلم لیگ (ق) حاکم تھی۔ میں ان دنوں اقرا یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا۔ وہ ایک عدد مسلح گارڈ کے ساتھ تشریف لائیں اور ملاقات کے بعد اپنی کتاب کا مسودہ دے کر مجھے اس کا پیش لفظ لکھنے کا ''حکم'' دے کر رخصت ہو گئیں۔ میں نے اکثر دولت مندوں، سیاست دانوں اور شہرت کے پجاریوں کو لکھاری یا مصنف بننے کے خبط میں مبتلا دیکھا ہے تاکہ وہ اپنے نام کے ساتھ دانش وری کے ''خطاب'' کا بھی اضافہ کر سکیں۔ چند دن مصروفیت کے سبب مسودہ دیکھ نہ سکا۔ انھوں نے فون پر یاد دہانی کرائی تو ایک رات مسودہ کھول کر پڑھنے لگا۔ چند پہرے پڑھنے کے بعد میں حیران اور پریشان ہو کر کتاب کی تیزی سے ورق گردانی کرنے لگا۔ یہ انکشاف میری حیرت کی انتہا تھی کہ محترمہ میری ہی ایک کتاب ''مسلم لیگ کا دور حکومت'' کو اپنے نام سے چھپوانے کے لیے مجھ سے پیش لفظ لکھوانے تشریف لائی تھیں۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ محترمہ نے مصنف بننے کے لیے کتاب کسی سے لکھوائی ہے اور اس قلمی مزدور نے آسان روزی (Easy Money) کمانے کے لیے میری کتاب پر مکمل ہاتھ صاف کر دیا ہے۔ اس انکشاف کے ساتھ میں زیر لب مسکرایا اور مسودہ بریف کیس میں رکھ دیا۔ دوسرے دن ان کا فون آیا، تو میں نے پوچھا سچ سچ بتائیے آپ نے یہ کتاب کس سے لکھوائی ہے۔ پہلے تو وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھیں، لیکن جب میں نے بتایا کہ محترمہ یہ میری ہی کتاب کی نقل مار کر مسودہ تیار کیا گیا ہے، تو وہ چکرا گئیں۔ کہنے لگیں ''اُس حرام زادے نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ میں اس کے بقایا 25 ہزار ہرگز نہیں دوں گی اور اسے دھوکا دہی کے جرم میں اندر کروا دوں گی''۔ یہ بھی حکمت الٰہی تھی کہ وہ پیش لفظ لکھوانے میرے پاس تشریف لائیں، اگر وہ کسی حکمران سے پیش لفظ لکھوا کر کتاب اپنے نام سے چھاپ لیتیں اور ہمارے بااثر دوستوں کے مانند ہر بڑے شہر میں تقریب رونمائی برپا کرتی چلی جاتیں، تو میں ان کا کیا بگاڑ لیتا۔ ان کی پبلسٹی کے نقار خانے میں میری طوطی کی آواز کون سنتا؟ پاکستان میں لوگ دوسروں کی جائیدادوں پر، بیواؤں اور یتیموں کی زمینوں پر قبضے کر لیتے ہیں اور سرکاری املاک کو ذاتی املاک بنا لیتے ہیں، وہاں محض ایک کتاب کا کیا رونا؟

آج سے چند برس قبل میں نے ایک کالم میں ساہیوال کے ڈاکٹر نیاز ہومیو پیتھک کا ذکر کیا تھا کہ وہ کینسر کے لاعلاج مریض اپنے والد گرامی کو جرمنی سے ہیومیو پیتھی کے ذریعے مکمل طور پر صحت یاب

Marfat.com

کروانے کے بعد واپس لوٹے تو صدقہ جاریہ کے طور پر اپنا کلینک کھول لیا اور مریضوں کا نہ صرف مفت علاج کرتے، بل کہ دوائیاں بھی مفت دیتے تھے۔ چند ماہ قبل مجھے ملتان سے ایک صاحب کا فون آیا کہ آپ نے کالم میں لکھا تھا ڈاکٹر نیاز مفت علاج کرتے ہیں، جب کہ مجھ سے انھوں نے آٹھ ہزار روپے وصول کیے ہیں۔ مجھے صدمہ ہوا۔ تحقیق کی تو پتا چلا کہ یہ صاحب لاہور سے ملتان جاتے ہیں اور انھوں نے اپنا نام ڈاکٹر نیاز رکھ لیا ہے، میرا کالم بھی فریم کروا کر رکھا ہوا ہے اور لاکھوں کما رہے ہیں۔ میں نے ساہیوال میں ڈاکٹر نیاز کو فون کیا تو انھوں نے بتایا کہ دس ہومیو پیتھک ڈاکٹروں نے میرے نام پر دھندہ شروع کرکے مریضوں کو لوٹنے کا جال بچھا رکھا ہے۔ میں نے اس دکھ سے اپنا کلینک ہی بند کر دیا ہے۔ نتیجہ ہزاروں غریب مریض مفت علاج سے محروم ہو گئے ہیں۔ خود نام پیدا کرنے کے بجائے ہم کامیاب ناموں کو استعمال کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔ میرے تجربات کے عجائب گھر میں بڑے بڑے نادر نمونے رکھے ہیں۔ فی الحال انھی پہ اکتفا کیجیے۔

ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جنھوں نے اپنے وسائل خدمت خلق اور رضائے الٰہی کے لیے وقف کر رکھے ہیں، لیکن جعلی دوائیاں بنا کر انسانی جانوں سے کھیلنے والے، اشیائے خوردنی میں ملاوٹ اور منرل واٹر کے نام پر آلودہ پانی پلانے والے، اغوا برائے تاوان، ڈاکہ زنی، دھوکا دہی، مٹن کے نام پر گدھوں، کتوں کا گوشت کھلانے والے، عمرے اور حج کے نام پر دھوکا دینے والے اور ہر قسم کا فراڈ کرکے لوٹنے والے اکثریت میں ہیں۔ صرف آج کے اخبار کی دو خبریں یہ راز فاش کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ہم کتنے بڑے جعل ساز ہیں۔ پہلی خبر کے مطابق ایک پاکستانی نے دھوکا دے کر ایک غیر ملکی نومسلم سے فون پر اپنی ہی بیوی کا نکاح پڑھوا کر اس سے ایک کروڑ روپے ہتھیا لیے۔ دوسری خبر ہے کہ ایک صاحب نے سزا سے بچنے کے لیے اپنی ہی بہن سے نکاح کا نکاح نامہ عدالت میں پیش کر دیا۔ صاحبو! سچ یہ ہے کہ جعل سازی میں دنیا کی کوئی قوم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم اس فن میں سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

ے ہم سا ہو تو سامنے آئے

Marfat.com

باطنی صفائی، تربیت اور قرب الٰہی کے لیے راہنمائی کے ساتھ ساتھ اپنے مرید کے احوال پر بھی نگاہ رکھے اور اسے بھٹکنے سے بچائے، اگر مرشد آپ کے احوال سے آگاہ رہنے کی صلاحیت، درجہ یا مقام نہیں رکھتا، تو وہ مرشد کامل نہیں ہوسکتا، کیوں کہ ہر روحانی شخصیت کا یہ مقام نہیں ہوتا کہ وہ جس پر نگاہ ڈالے یا نگاہ رکھے ،اس سے باخبر بھی ہو جائے اور اس کی قلبی وارداتوں اور دنیاوی مصروفیات سے بھی روحانی طور پر آگاہ رہنے لگے۔ نہ ہی ہر شخص متلاشی اور مرید اس قابل ہوتا ہے کہ مرشد اُس پر اتنی توجہ دے۔ یہ معاملے خلوص، محبت، تڑپ اور مقدر کے ہوتے ہیں کبھی کبھی ایسے مرشد کی پشت پر کسی ایسی ہستی کا ہاتھ یا سایہ بھی ہوتا ہے، جو دنیا میں موجود نہیں ہوتی، لیکن صاحب نظر اسے پہلی نگاہ میں ہی دیکھ لیتا ہے اور اس غیر مرئی ہاتھ کے احترام میں توجہ دینی شروع کر دیتا ہے، لیکن اس راز کو کبھی فاش نہیں کرتا۔ دراصل روحانی دنیا رازوں کی دنیا ہے اور یہاں ادب کا پہلا تقاضا ہی راز ہے، خاموشی ہے اور صبر ہے۔

سوال یہ ہے کہ مجھے مرشد اور مرشد کامل کا فرق کیوں کر محسوس ہوا؟ میں نے نہ ہی ان موضوعات پر کتابیں پڑھی ہیں اور نہ ہی میں عبادت گزار انسان یا صوفی ہوں۔ میں ایک سیدھا سادا دنیادار انسان ہوں، لیکن عمر بھر روحانی تشنگی کے سبب روحانی چراغوں کا متلاشی ضرور رہا ہوں اور مجھے یقین ہے، اگر انسان کی لگن سچی ہو تو اسے کبھی نہ کبھی ایسا صاحب نگاہ فقیر ضرور مل جاتا ہے، جو اس پر توجہ دیتا اور روحانی تربیت کا بیڑا اُٹھا لیتا ہے۔ مرشد اور مرشد کامل کا فرق واضح کرنے کے لیے کچھ چھوٹے چھوٹے تجربات بیان کرنے مجوری ہے، ورنہ بات واضح نہیں ہوگی، چناں چہ میں کتابی واقعات لکھنے کے بجائے اپنے ذاتی چند تجربات ضبط تحریر میں لانے پر مجبور ہوں، ورنہ جی نہیں چاہتا کہ ان یادوں سے پردہ اُٹھاؤں۔

1978ء میں، میں جنرل ضیاء الحق کے زیر عتاب آ گیا اور سرکاری جکڑ کے مراحل سے گزرنے لگا۔ ایک دن جی چاہا کہ آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار عبدالقیوم سے ملوں، جن سے میری شناسائی تھی۔ اول تو اس لیے کہ سردار صاحب صحیح معنوں میں مجاہد تھے اور دوسرے اس لیے کہ وہ بھی جنرل ضیاالحق کے زیر عتاب تھے، کیوں کہ وہ بھٹو کو پھانسی دینے کے مخالف تھے۔ اس حوالے سے انھوں نے جنرل ضیاالحق کو خط بھی لکھا تھا، جو انھوں نے مجھے پڑھایا اور جس کے بعد دونوں کے درمیان اختلافات کی خلیج گہری ہوتی چلی گئی۔ ان دنوں سردار صاحب سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں کاکا جی ہاؤس کے ایک کمرے میں فرش نشین تھے۔ کاکا جی ہاؤس سردار صاحب کا مرشد خانہ تھا اور کاکا جی کے مرحوم والد گرامی ان کے مرشد تھے ،جو اپنے زمانے میں ولایت کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ ظاہر ہے کہ سردار عبدالقیوم جیسے باغی اور مرد مجاہد

Marfat.com

حِکمت

ڈاکٹر صفدر محمود

Marfat.com